کیفی اعظمی: حیات اور شاعری

مقالہ برائے پی ایچ. ڈی

پیش کردہ

محمد اسعد

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی، فیض آباد (یو. پی)

نگراں

ڈاکٹر محمد نسیم خاں

صدر شعبۂ اردو

بابا برواداس پوسٹ گریجویٹ کالج

پروئیا آشرم، ضلع امبیڈکر نگر

۲۰۱۰ء

KAIFI AZMI
HAYAT AUR SHAERI

Thesis

SUBMITTED TO

DR. RAM MANOHAR LOHIA AVADH UNIVERSITY

FAIZABAD

FOR THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

BY

MOHD. ASAD

Under Supervision of

Dr. Mohd. Naseem Khan

Head

DEPARTMENT OF URDU

B.B.D.P.G. COLLEGE PARUIYA ASHRAM,

DISTT. AMBEDKAR NAGAR

2010

اب جس طرف سے چاہے گزر جائے کارواں
ویرانیاں تو سب مرے دل میں اتر گئیں

کیفی

فہرست ابواب

پیش لفظ ۵

باب اول ۱۶

سلسلۂ نسب اور سوانحی حالات

باب دوم ۷۱

تاریخی، سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر

باب سوم ۱۱۰

کیفی اعظمی کی نظم گوئی

باب چهارم ۱۸۹

دیگر اصناف سخن پر طبع آزمائی

باب پنجم ۲۳۵

کیفی اعظمی کے مجموعی کلام کا تنقیدی جائزہ

باب ششم ۲۸۱

حرف آخر ۲۸۲

کتابیات ۲۹۰

پیش لفظ

ترقی پسند تحریک اور اس سے متاثر شعراء کی طویل فہرست میں کیفی اعظمی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنے فکر و فن اور نگاہ دوررس سے اردو شاعری کو نہ صرف یہ کہ مالا مال کیا بلکہ فکر و نظر کے دریچے کھول کر دیرپا اثرات بھی مرتب کئے۔ بلاشبہ ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، سیمینار بھی ہوئے پھر بھی راقم کی نگاہ میں ایک مبسوط تحقیق و تنقیدی تصنیف کی اب بھی ضرورت ہے، جو کیفی کی حیات اور شاعری پر خاطر خواہ روشنی ڈال سکے۔ یہی احساس اس مقالے کی تحریر کا محرک ہے۔ کیفی کی حیات اور شاعری کا سیر حاصل جائزہ لینے کے خیال سے راقم نے اس مقالے کو چھ ابواب میں منقسم کیا ہے۔

باب اول میں کیفی اعظمی کی داستان حیات لکھنے کے سلسلے میں ان کے خاندانی پس منظر، حسب ونسب، گھریلو ماحول، ادبی فضا، ابتدائی تعلیم، لکھنؤ میں اعلیٰ دینی تعلیم کی غرض سے قیام، اپنے گاؤں کی ترقی کیلئے جدوجہد، اخلاق و اطوار، شاعری کا آغاز اور اس کے محرکات، فکر معاش میں سرگردانی وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالات قلمبند کرنے کے سلسلے میں پوری تحقیق و تفتیش سے حالات اور واقعات کو چھان بین کر ہی پیش کیا گیا ہے۔ وہ تمام شواہد اور معلومات جو تحقیق کے دوران حاصل ہوئیں ان کو بعینہٖ تسلیم کر لینے اور قلمبند کر دینے کے بجائے مختلف گوشوں سے اس کا تحقیقی جائزہ لیکر ہی قلمبند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسے واقعات یا شہادتیں، جو میرے نزدیک معیار پر کھری نہیں اتریں انہیں ترک کر دیا گیا۔

باب دوم میں کیفی اعظمی کا عہد کے عنوان کے تحت اس زمانے کے تاریخی، سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس باب میں کیفی اعظمی کے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کیفی کا اس سے رابطہ اور تعلق پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ کیفی نے جس دور میں آنکھ کھولی اور اپنے فن کو پروان چڑھایا وہ

سیاسی اعتبار سے ملک میں افراتفری اور بدامنی کا دور تھا۔ ہندوستان پر انگریز قوم کی حکمرانی اوران کے ناروا سلوک نے ان کے خلاف نفرت وتشدد کی آگ بھڑکادی تھی۔اس آتش انقلاب کوفرو کرنے کیلئے سامراجی طاقتیں پوری طرح ظلم وتشدد پرآمادہ ہوکر ہندوسانی عوام کواستحصال کا شکار بنارہی تھیں۔غرض کہ ملک میں ہرطرف بدامنی کا دور تھا سیاسی اور معاشی صورت حال بد سے بدتر ہوتی جارہی تھیں۔نیز آزادی کی جدوجہد ترقی پسند تحریک اس کے اصول ونظریات اوراغراض ومقاصد کو بیان کرتے ہوئے کیفی کے ہمعصر شعراء اور ان کے عہد نے کیفی پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں اور بحیثیت شاعران کے مقام ومرتبہ کو مشاہیر ادب کی آراء کے پیش نظر متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم میں کیفی کے سرچشمۂ فکر کے آئینہ میں ان کی نظموں کے اسلوب ونظریات اورزبان وبیان کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔کیفی اعظمی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں ان کی نظموں کوقبول عام میں شہرت حاصل ہوئی۔کیفی صاحب نے غزلیں بھی کہی ہیں بعض ترقی پسندوں کے مطابق اردو شاعری کو سب سے زیادہ نقصان غزل گوئی سے ہوا۔نتیجتاً ترقی پسندوں نے غزل گوئی سے احتراز کیا۔لیکن بعد میں شاعروں نے غزل میں قلم آزمائی کی۔توانہوں نے غزل کی زبان اس کے مزاج تشبیہوں اوراستعاروں سے کنارہ کشی اختیار کرکے نئے انداز اور نئے الفاظ اور تشبیہات کے سائے میں غزلیں کہیں جن کی تعداد حالانکہ کم ہی ہے لیکن ان کی غزلوں پر نظم کا اثر غالب ہے۔کیفی صاحب نے خود ہی یہ واضح کردیا ہے کہ انکی نظموں کے موضوعات کا جو مخرج ہے وہی غزلوں کا بھی ہے۔ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میرا بچپن بھی ساتھ لے آیا
گاؤں سے جب بھی آگیا کوئی

....

آج پھر ٹوٹیں گی تیرے گھر کی نازک کھڑکیاں
آج پھر لوٹا گیا دیوانہ تیرے شہر میں

خاروخس تو اٹھیں راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے

....

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمیں نیا آسماں نہیں ملتا

....

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا تھا قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا

....

کہیں اندھیرے سے مایوس ہو نہ جائے ادب
چراغ تیز ہوا نے بجھائے ہیں کیا گیا

....

انساں کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں
دو گز زمیں بھی چاہئے دو گز کفن کے بعد

....

اعلان حق میں خطرہ دارورسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دارورسن کے بعد

....

شور یونہی نہ پرندوں نے مچایا ہوگا
کوئی جنگل کی طرف شہر سے آیا ہوگا

پیڑ کے کاٹنے والوں کو یہ معلوم تو تھا
جسم جل جائیں گے جب سر پہ نہ سایا ہوگا

کیفی نے اپنے مزاج کے مطابق ہی غزلیں ان کی غزلوں کی کل تعداد بارہ ہے، گیارہ آوارہ سجدے میں اور ایک متفرقات کے تحت شامل ہے۔ جھنکار اور آخر شب میں کوئی غزل نہیں ہے۔ کیفی کی غزلوں کا بھی قریب قریب وہی رویہ اور رنگ ہے، جو ان کی نظموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہی کھر دراپن، وہی سختی وہی تندہی اور ترشی جو ان کے ذاتی تجربات کا پرتو کہی جاسکتی ہے۔

باب چہارم میں کیفی اعظمی کی نظم نگاری کے علاوہ جن اصناف سخن میں انہوں نے اپنی فکر رسا سے گلکاریاں کیں مثلاً غزل، مثنوی خانہ جنگی اور ان کی فلمی شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے اسکا تحقیقی اور تنقیدی محاسبہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ کیفی اعظمی اپنے کچھ غزلوں کی وجہ سے ترقی پسند غزل گو کی صف میں نمایاں حیثیت لئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ انہوں نے بھی عام روایت کے مطابق اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی ہے، خود کیفی کے قول کے مطابق:

''یہ میری پہلی غزل ہے جو میں نے گیارہ برس کی عمر میں کہی تھی۔''

وہ غزل یہ ہے:

اتنا تو زندگی میں کسی کے خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہرحال چل پڑے
ساقی سبھی کو ہے غم تشنہ لبی مگر
مے ہے اسی کے نام پہ جس کے ابل پڑے

مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہوگیا مگر آنسو نکل پڑے

مثنوی ''خانہ جنگی'' میں پہلی بار عصری سیاست کو مثنوی کے قالب میں پیش کیا گیا۔کیفی پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے با قاعدہ سیاسی اور سماجی حالات اور فرقہ وارانہ فسادات کو واقعاتی اور تصوراتی رنگ دے کر مثنوی خانہ جنگی کی تخلیق کی۔ بقول علی احمد فاطمی:

''سیاسی افکار و خیالات سے لبریز کیفی اعظمی کی یہ مثنوی ایک کامیاب تجربہ ہے اور اردو مثنوی کا ایک خوبصورت توسیعی و ارتقائی قدم ہے، جسے جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔''

کیفی صرف وطن پرست ہی نہیں بلکہ انسان اور انسانیت پسند بھی تھے۔ وہ اپنے اس پیغام محبت کے ساتھ کہ:

پیار کا جشن نئی طرح منانا ہوگا
غم کسی دل میں سہی غم کو مٹانا ہوگا

وہ ساری دنیا کی مشکلوں اور پریشانیوں سے مغموم اور افسردہ خاطر ہیں۔ وطن کی الفت، سماجی، سیاسی اور عمرانی مسائل کے ساتھ زندگی کے تقاضوں کو بھی انہوں نے اپنے فلمی گیتوں میں پرو دیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیو!
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو!

....

پھوٹ کا دشمنی کا اندھیرا بھی ہے
ہر قدم پر غریبی کا ڈیرا بھی ہے

....

ہو کے مجبور مجھے اس نے بلایا ہوگا
زہر چپکے سے دوا جان کے کھایا ہوگا

....

جانے کیا ڈھونڈھتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے

....

ہاتھوں میں کچھ نوٹ لو پھر چاہے جتنے ووٹ لو
کھوٹے سے کھوٹا کام کرو باپو کو نیلام کرو

باب پنجم میں کیفی اعظمی کے کلام کا بطور مجموعی تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کی ادب میں اہمیت و انفرادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کیفی کی شاعری میں عورت کے مقام اور ان کے اسلوب بیان کو خصوصاً موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ جدید عورت کا تصور ترقی پسند تحریک سے ابھرا اور اسے اس کے حقیقی روپ میں پیش کرنے کی کوشش، جاں نثار اختر، مجاز، ساحر اور علی سردار جعفری کے علاوہ بعض دوسرے شاعروں نے کی۔ کیفی اعظمی ترقی پسند شعراء میں ممتاز مقام پر فائز ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں بھی عورت کا ایک مخصوص تصور نظر آتا ہے۔ عورت کی بے حرمتی، ناقدری اور ارزانی سے کیفی ملول ہوتے ہیں اور اس ملک وقوم سے نفرت کرتے ہیں، جہاں عورت کی عصمت و آبرو محفوظ نہیں۔ وہ آزادی نسواں کی حمایت کرتے ہیں اور اس خیال سے متنفر ہیں، جس نے عورت کو صدیوں تک غلامی کی زنجیروں میں الرجال قوامون علی النساء کی غلط تاویل سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ ہر منزل حیات میں عورت کو مردوں کے دوش بدوش دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کی صلاحیتوں سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں

اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جاں مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تعلیم یافتہ اور بیدار عورت کیفی کے نزدیک وقار انسانیت اور تہذیب کا شاہ کار ہے۔عورت کی اس بیداری کو نذرانہ سلام یوں پیش کرتے ہیں:

حوصلے جاگ اٹھے سوز یقیں جاگ اٹھا
نگہ ناز کے بے نام اشاروں کو سلام
تو جہاں رہتی ہے اس ارض حسیں پر سجدہ
جن میں تو ملتی ہے ان راہ گزاروں کو سلام

یہی بیداری اور تعلیم سے مزین عورت جب ماں کا روپ دھار لیتی ہے اور سروجنی نائیڈو جیسا کردار اختیار کر لیتی ہے تو شاعر ایسی ماں کی خدمت میں یوں خراج عقیدت پیش کرتا ہے:

ذرا زمین کو محور پہ گھوم لینے دے
یہ دنیا تجھ سے ترا سوز وساز مانگے گا
جمال سیکھے گا خود اعتمادیاں تجھ سے
حیات نو ترے دل کا گداز مانگے گی

اور جب یہی عورت بہادر بیٹی بنکر نمودار ہوتی ہے اور عظمت و کردار کی شناخت بن جاتی ہے تو شاعر شفیق وہمدرد باپ کی حیثیت سے بیٹی کو زندگی کی کامرانیوں کی دعایوں دیتا ہے:

اب او رکیا تیرا بیمار باپ دے گا تجھے
بس اک دعا کہ خدا تجھ کو کامیاب کرے

وہ ٹانک دے ترے آنچل میں چاند اور تارے

تو اپنے واسطے جس کا بھی انتخاب کرے

ترقی پسند شاعری میں مواد کو بنیادی اور اسلوب کو ثانوی حیثیت حاصل رہی ہے۔اس وجہ سے ترقی پسند شاعری کا زیادہ تر سرمایہ بیانیہ ہے۔ترقی پسند شاعری میں ایسے اسلوب پر زیادہ زور دیا گیا، جو اجتماعی ہو اس طرح انفرادیت کو خارج از امکان قرار دیا گیا۔کیفی کے اسلوب میں ترقی پسند شعری اسلوب کی عام خصوصیات موجود ہیں ساتھ ہی ان کے اسلوب میں وہ خصوصیات بھی ہیں، جو ان کی انفرادیت کہی جاسکتی ہیں۔کیفی مزدوروں اور محنت کش عوام کے شاعر ہیں اس لئے ان کا اسلوب بھی ایسا ہے، جو اس طبقے سے مطابقت رکھتا ہو یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب فنی پیچیدگیوں سے مبرا ہے۔

کیفی کی نظمیں ملک میں پھیلی ہوئی سیاسی اتھل پتھل لیڈروں کے داؤں پیچ اور ان کے پرفریب وعدے اور سماجی ناہمواریوں کی تصویریں ہیں۔کیفی نے ان تمام کیفیات کا بغائر جائزہ لیا اور انہیں اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔بقول مظفر حنفی:

''شدت احساس اور جذبے کی کارفرمائی نے کیفی اعظمی کی ترقی پسندانہ شاعری میں طنزیہ اسلوب کا بھی جادو جگایا ہے۔''

باب ششم اس مقالہ کا حرف آخر ہے۔اس میں کیفی اعظمی کی شخصیت اور شاعری کا مجموعی تنقیدی جائزہ ان کے عہد کے تقاضوں اور خصوصیات کے جائزے کے تحت پیش کیا گیا ہے۔یہی باب اس مقالہ کا حاصل کلام ہے۔

اس عظیم کام کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچانے میں جن کرم فرماؤں کی نوازشات شامل رہیں ان کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا اولین فرض تصور کرتا ہوں ان میں سرفہرست میرے استاد محترم ڈاکٹر محمد نسیم خاں صاحب ہیں، جو اس مقالے کے نگراں ہیں۔اس ضمن میں یہ اعتراف میرے لئے ناگزیر ہے کہ اگر موصوف کی دلی ہمدردیاں شامل حال نہ ہوتیں تو یہ کام انجام دے سکنا میرے لئے امر محال تھا۔موصوف کے کتب خانے ان کی

ہدایات اوران کے ذریعے حاصل ماخذات کا میں کہاں تک ذکر کروں بحیثیت مجموعی مختصراً عرض ہے کہ یہ مقالہ انہیں کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہے، میں ان کا تہہ دل سے جتنا شکریہ ادا کروں حق ادا نہ ہوگا۔

میرے ادبی شعور کی تربیت میں جن اساتذہ کرام کی شخصیات نے نمایاں کردار ادا کیا ان میں فاخر صاحب جلالپوری، انور جلالپوری، ڈاکٹر محبوب عالم اور ڈاکٹر آفاق فاخری کے اسمائے گرامی بطور خاص ہیں۔ میں ان سب کا بیحد شکرگزار ہوں۔ بزرگ صحافی جناب اسرار باغی صاحب کا میں احسان مند ہوں کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً میری حوصلہ افزائی کی، مجھے منزل مقصود کو پا لینے کی ہمت دلاتے رہے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھے میرے گھر کے ہر فرد کی مدد ہر جگہ ملتی رہی بڑے ابو ڈاکٹر خلیق احمد برابر اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازتے رہے۔ برادر محترم حاجی طیب الزماں صاحب نے مجھے قدم قدم پر حوصلہ دیا اور دعاؤں سے نوازا۔ بھائی محمد احمد صاحب نے اپنی صلاحیتوں سے متاثر کیا۔ محمد ارشد نے مقالے سے متعلق کتابوں کی فراہمی میں تعاون کیا۔ چھوٹے بھائیوں میں محمد اکرم اور محمد اظفر نے ہر جگہ اور ہر وقت مجاہدانہ اسپرٹ سے ساتھ دیا۔

اس سلسلے میں مرحوم والد محترم جناب محمد انیس الحسن صاحب کی شفقتیں یادگاری حیثیت رکھتی ہیں۔ موصوف کو میرے تعلیمی مشاغل سے والہانہ دلچسپی رہی۔ میری یہ ڈگری ان کی محبت کی رہین منت ہے۔ آپ کی شفقت اور حوصلے کے بغیر اس مقالے کی تکمیل کا تصور ہی محال تھا۔ لیکن افسوس! کہ جب یہ پایہ تکمیل کو پہنچا تو آپ اس دنیا میں نہیں رہے۔

آخر میں، میں اپنے ان دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جو خاندان کا فرد نہ ہوتے ہوئے بھی اہل خاندان کی ہی طرح عزیز ہیں۔ جنھوں نے مجھے اپنی محبت دوستی اور ادب نوازی سے گذشتہ پانچ برسوں سے زندگی کے ہر موڑ پر ساتھ دیا ان کے نام ہیں نذرالباری، افروز اختر، ظہیر احمد اور ڈاکٹر باقر مہدی۔

اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں جن کتابوں اور رسالوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور ان

کے براہ راست اقتباسات اس مقالے میں درج ہیں، ان کو کتابیات کے عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے ایسی بہت سی کتب رسائل و جرائد جو مطالعہ میں رہے لیکن ان کے اقتباسات شامل مقالہ نہیں ہیں، وہ اس فہرست میں درج نہیں ہیں۔

ان سب کے علاوہ اور بھی بہت سے دانشوروں، اساتذہ اور احباب کا میں یکجائی طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے وسیع علم ونظر سے مجھے مستفیض ہونے کا موقع ملا اور ان کی مفید نوازشوں سے میں اپنے مقالہ کی تکمیل کر سکا۔

راقم السطور نے اپنے مقالے کو غیر جانب دارانہ تحقیقی وتنقیدی نظر سے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے اس مقصد میں مجھے کس حد تک کامیابی ملی ہے، اس کے فیصلہ کے لئے ارباب دانش کی عدالت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

محمد اسعد

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو، بابا برواداس پی جی کالج

پروئیا آشرم، امبیڈکر نگر
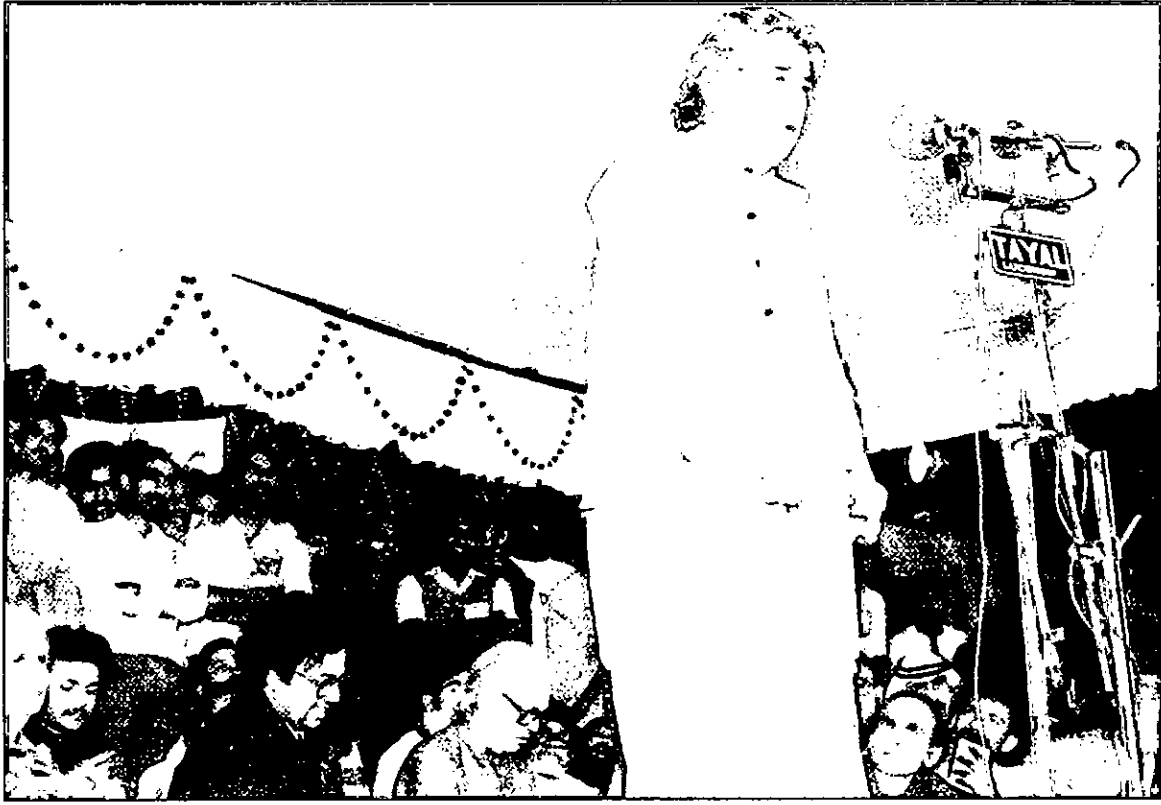
لکھنؤ کے ایک یادگار مشاعرے کا ایک منظر

لکھنؤ میں منعقدہ ایک ادبی سیمینار کا ایک منظر

ایک ادبی تقریب میں کیفی اعظمی، ڈاکٹر شارب ردولوی اور آغا سہیل

لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں کیفی اعظمی، ڈاکٹر ندا فاضلی اور ڈاکٹر بشیر بدر وغیرہ

باب اول

سلسلۂ نسب اور سوانحی حالات

کیفی اعظمی لکھنؤ میں ہندی صحافیوں کے ساتھ اس موقع پر خورشید افسر بسوانی اور فرقت لکھنوی بھی موجود تھے

جاتے ہیں میکدے سے میر

ایک ادبی جلسے میں کیفی اعظمی ہمہ تن گوش ہیں، ان کے ساتھ نظر آ رہے ہیں عبدالسلام صدیقی، ڈاکٹر نیر مسعود، انیس انصاری اور ممتاز ناقد شمس الرحمٰن فاروقی

لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں محوِ سخن کیفی اعظمی ساتھ انور جلالپوری اور نظر سلیم بھی نظر آ رہے ہیں

سلسلۂ نسب

سید اطہر حسین کیفی اعظمی - خاندان رضویہ کے ایک نجیب الطرفین راسخ العقیدہ شیعہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ان کے والد کا نام سید فتح حسین اور دادا کا نام میر عطا حسین رضوی تھا، جو ایک باعزت زمیندار تھے، کیفی کا خاندان عرصہ دراز سے تحصیل پھول پور ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مجواں جسے پڑھے لکھے یا شہر کے لوگ میزواں کہتے تھے، فروکش تھا۔ اس گاؤں میں سبھی مذاہب و عقائد کے لوگ نہایت میل و محبت سے رہتے تھے، عید، بقرعید، ہولی، دیوالی کے تہوار بستی کے سب لوگ اس طرح مل کر مناتے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کس فرقہ کا تہوار ہے۔

کیفی کے دادا میر عطا حسین ایک سچے محب وطن تھے، ان کے بارے میں کیفی کا بیان ہے کہ:

''بزرگوں سے میں نے سنا ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے نیل کی کاشت شروع کرائی تو ہمارے گاؤں میں نیل کے بیج آئے اور کارندوں کی زبانی پیغام بھی آیا کہ جو گیہوں بونا چھوڑ دو نیل کی کھیتی شروع کرو تو کمپنی بہادر تم کو مالا مال کر دے گی۔ میرے دادا مرحوم نے جب یہ سنا تو انہوں نے رازدارانہ طور پر گاؤں والوں کو سمجھایا کہ دیکھو کمپنی ہمارے کاریگروں کے انگوٹھے کاٹ کر ہماری صنعت اور تجارت کو ٹھکانے لگا چکی ہے اب کھیتی باڑی کو بھی تباہ کرنا چاہتی ہے، اس لئے چپکے چپکے بونے سے پہلے ان بیجوں کو بھون ڈالو بھنے ہوئے بیج اگ نہیں سکتے اور جب وہ اگیں گے نہیں تو کمپنی یہ سمجھے گی کہ اس گاؤں کی زمین نیل کی کھیتی کیلئے مناسب نہیں اور ہم کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ دادا

مرحوم نے خود یہی کیا اور ان کے مشورے پر کچھ اور لوگوں نے ایسا ہی کیا جب نیل کے بیج اگے نہیں تو کمپنی یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئی کہ اس گاؤں کی زمین اچھی نہیں ہے لیکن کچھ دنوں میں یہ بات سب کو معلوم ہوگئی کہ کسانوں نے نیل کے بیج میر عطا حسین کے کہنے پر بھون ڈالے تھے۔ دادا مرحوم پر مقدمہ چلا جائداد ضبط ہوگئی لیکن اس کے بعد کمپنی نے ہمارے گاؤں کے لوگوں کو نیل بونے پر مجبور نہیں کیا دادا مرحوم نے کمپنی کے خلاف نفرت کا جو بیج نیل کے کھیتوں میں بویا تھا وہ ایک دن میرے سینے میں پھوٹا اور پھولا پھلا۔'' (۱)

کیفی کے والد سید فتح حسین ایک تعلیم یافتہ اور روشن دماغ انسان تھے، انہیں زمینداری اور کھیتی باڑی سے کوئی لگاؤ نہیں تھا وہ خدا معلوم کیسے جانتے تھے کہ ہندوستان میں زمینداری کا مستقبل تاریک ہے اس لئے انہوں نے کھیتی باڑی پر ملازمت کو ترجیح دی۔ گھر والوں کی حد درجہ مخالفت کے باوجود وہ مجواں چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے اور یہاں آنے پر انہیں آخر کار ریاست بلہرہ میں تحصیل داری مل گئی اس کے بعد انہوں نے اپنے اہل و عیال کو لکھنؤ بلا لیا۔ اپنے بڑے بیٹے کو علی گڑھ تعلیم کیلئے بھیج دیا اور دو بیٹوں کو لکھنؤ میں تعلیم دلوائی۔ انہوں نے راجہ محمود آباد کی جاگیر میں تحصیلداری کی اور پھر بہرائچ میں نواب نوازش علی خاں کے مختار عام کی حیثیت سے بہت دنوں تک کام کرتے رہے۔ یہ ان کی ملازمت تھی، اس کے باوجود انہوں نے مجواں سے کبھی ناطہ نہیں توڑا۔ اپنے بھائیوں کو برابر پیسے بھیجتے رہے اور آخر میں گاؤں میں اچھا سا گھر بنوایا۔

کیفی کی والدہ کا نام سیدہ حفیظ النساء عرف کنیز فاطمہ تھا، جن کے بطن سے سید فتح حسین کی گیارہ اولادیں جن میں پانچ بیٹیاں اور چھ بیٹے تھے تولد ہوئیں۔ ان کے نام ہیں-ظفر حسین تخلص مجروحؔ- قمر النساء- یوسف حسین تخلص بیتابؔ- شبیر حسین تخلص وفاؔ- اقبال جہاں عرف واجدہ بیگم- محسنہ بیگم- آمنہ بیگم- اطہر حسین رضوی کیفی - صابرہ خاتون اور خادم عباس عرف چھبن اور بچھن عرف پرویز (چھبن اور بچھن جڑواں پیدا ہوئے تھے) آمنہ بیگم کا تین سال میں اور چھبن کا ایک سال کی عمر میں

(۱) میں اور میری شاعری- کیفی اعظمی- کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔

انتقال ہوگیا تھا۔ کیفی اعظمی (اطہر حسین) تین بھائیوں اور چار بہنوں سے چھوٹے تھے، اس لئے گھر میں سب کے بڑے چہیتے تھے، خصوصاً ان کی بڑی بہن واجدہ ان پر جان چھڑکتی تھیں اور کیفی بھی اپنا سارا دکھ درد انہیں سے بیان کرتے تھے۔

لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ آزادی کے بعد کیفی کو چھوڑ کر باقی ان کے خاندان کے سبھی لوگ پاکستان ہجرت کر گئے اور دوسری بستیوں کی طرح مجواں کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔

کیفی کی ولادت

کیفی اعظمی مجواں، تحصیل پھول پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں مختلف روایات ہیں، خود کیفی کو بھی اپنی تاریخ پیدائش معلوم نہیں وہ اس سلسلے میں نہایت مبہم سی بات کہتے ہیں، مثلاً:

"کب پیدا ہوا........................یاد نہیں"

"کب مروں گا........................معلوم نہیں" (۱)

محمد ایوب واقف راوی ہیں:

"کیفی اعظمی کی تاریخ پیدائش نہ تو کیفی صاحب کو معلوم ہے اور نہ ان کے خاندان کے دوسرے افراد کو، وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں دیہی علاقوں میں پیدائش کی تاریخیں بایدوشاید رکھی جاتی تھیں۔" (۲)

نند کشور وکرم کیفی کی تاریخ پیدائش ۱۴ر جنوری ۱۹۱۴ء بتاتے ہیں۔ (۳)

سید احتشام حسین نے اپنی کتاب اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں کیفی کا سن ولادت ۱۹۱۷ تحریر کیا

(۱) میں اور میری شاعری۔کیفی اعظمی۔کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۳۳۔

(۲) میرا پڑوسی۔محمد ایوب واقف کیفی اعظمی۔کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۹۰۔

(۳) عالمی اردو ادب ۸۸-۱۹۸۷ء مرتب نند کشور وکرم جلد ۳ ص ۴۰۷

ہے۔(۱)

تصویر بتاں از صابر دت میں کیفی کی تاریخ ولادت ۱۴؍جنوری ۱۹۲۴ء لکھی ہے۔(۲)

کالی داس گپتا رضا جنوری ۱۹۲۰ء بتاتے ہیں۔(۳)

اطہر نبی اور شاہ نواز قریشی کیفی کی تاریخ ولادت بہ اتفاق رائے ۲۱؍جنوری ۱۹۱۸ء لکھتے ہیں۔(۴)

کیفی اعظمی کا سن ولادت ولادت ۱۹۱۸ء لکھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی (۵) ڈاکٹر مظفر حنفی (۶) ڈاکٹر حامدی کشمیری (۷) انور سدید (۸) اطہر نبی اور شاہ نواز قریشی وغیرہ وغیرہ غرضکہ سبھی نے سال ولادت ۱۹۱۸ء تحریر کی ہے اور سلطان المدارس لکھنؤ کی ریکارڈ فائل میں کیفی کی تاریخ پیدائش ۱۵؍اگست ۱۹۱۸ء درج ہے۔(۹)

جھنکار کے دیباچے میں سجاد ظہیر نے ۱۹۴۳ء میں لکھا ہے۔

’’کیفی ابھی نوجوان ہیں ان کی عمر ۲۶ سال سے کم ہے۔(۱۰)

مالک رام اپنے تذکرے میں کیفی کی تاریخ پیدائش ۱۴؍جنوری ۱۹۲۴ء تحریر کرتے ہیں۔(۱۱)

ان قیاسی روایات کی رو سے کیفی کا سال ولادت ۱۹۱۸ء ہی قرار پاتا ہے، مختصراً یہ کہ کیفی کی صحیح تاریخ پیدائش کا تعین تو مشکل ہے لیکن ان متضاد بیانات اور کثرت رائے کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کیفی کا سال ولادت ۱۹۱۸ء ہو سکتا ہے۔

---

(۱) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ احتشام حسین ص ۲۸۴ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۸ء۔

(۲-۳) تصویر بتاں صابر دت ص ۳۲۲۔

(۴) فکر و فن اور شخصیت اطہر نبی شاہ نواز قریشی سہارا انڈیا پریوار ۱۹۹۴۔

(۵) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۶۔

(۶) جہات و جستجو ڈاکٹر مظفر حنفی طبع اول۔

(۷) جدید اردو نظم اور یوروپی اثرات ڈاکٹر حامدی کشمیری ص ۳۳۷ مجلس اشاعت ادب دہلی ۱۹۶۸۔

(۸) کیفی معاملات جہاں کا شاعر انور سدید کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز۔

(۹) نیا دور لکھنؤ کیفی اعظمی نمبر ص ۱۱۵۔

(۱۰) پیش لفظ ’’جھنکار‘‘ کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔

(۱۱) تذکرہ ماہ و سال ص ۳۲۱ مالک رام مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی ۱۹۹۱۔

تعلیم وتربیت

رواج زمانہ کے مطابق کیفی کی ابتدائی تعلیم مشرقی طرز کے ایک مدرسے میں ہوئی، جہاں انہوں نے قرآن شریف کے علاوہ اردو فارسی کی درسیات حاصل کیں۔ بقول علی سردار جعفری:

''روایتی ڈھنگ سے مدرسے میں مشرقی تعلیم حاصل کرتے ہوئے اطہر حسین (اصلی نام) نے اردو اور فارسی سیکھی۔''(۱)

اپنے بڑے بھائیوں کی طرح کیفی انگریزی اسکول میں پڑھنا چاہتے تھے لیکن ان کے والد کا منشاء تھا کہ وہ انہیں دینیات کی تعلیم دلوا کر مولوی بنائیں گے، اس زمانے میں کیفی کی کئی بڑی بہنیں یکے بعد دیگرے بیمار رہ کر فوت ہو چکی تھیں چنانچہ ان کے والد کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ یہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی سزا ہے، جو قدرت نے ہمیں دی ہے وہ وہم تھا، جس سے انہوں نے انگریزی کے بجائے دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر کہتے تھے کہ ''جب ہم مرجائیں گے تو کوئی بیٹا فاتحہ نہ پڑھ سکے گا۔'' اس لئے کہ انگریزی اسکولوں میں فاتحہ پڑھنا سکھایا نہیں جاتا۔ اس بنا پر انہوں نے کیفی کو مولوی بنانے کا فیصلہ کیا، جبکہ ان کے چچا انہیں زمینداری اور کاشتکاری سنبھالنے کیلئے کہتے تھے اور کچھ بھی پڑھانے کے خلاف تھے، اسی ادھیڑ بن میں ابتدائی عمر کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ لیکن کیفی اعظمی اپنے طور پر مصروف مطالعہ رہتے تھے، گھر کا ماحول شاعرانہ تھا، اردو فارسی کے بہت سے دواوین گھر میں موجود تھے، جن کا کیفی بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس لئے کیفی کو بڑی تعداد میں اشعار یاد ہو گئے تھے۔

سلطان المدارس لکھنؤ میں داخلہ

لکھنؤ کے مشہور شیعہ دینی مدرسہ سلطان المدارس میں کیفی کو ان کے والد نے دینی تعلیم سے مزین کر دینے کی غرض سے داخل کر دیا تھا اس وقت کیفی پندرہ سولہ برس کے ہوں گے۔ شعر کہنے کا ذوق وشوق گھر

---

(۱) کیفی اعظمی علی سردار جعفری عکس اور جہتیں۔ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔

کے ماحول نے ہی پیدا کر دیا تھا اور طرفہ تر یہ کہ لکھنؤ کی ادبی فضا نے ان کے اشہب شوق کو اور مہمیز کر دیا۔ ذوق شعر وادب ان کی فطرت ثانیہ تھی، جبکہ وہ سلطان المدارس کی دقیانوسی فضا سے بیزار تھے۔ سلطان المدارس کی تعلیم کا ایک واقعہ ڈاکٹر قمر رئیس اس طرح بیان کرتے ہیں:

''وہ عالم کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے، مدرسے کے ایک مولوی نے نہج البلاغہ پڑھانے کیلئے انہیں سحری کے وقت گھر بلالیا، وہ مولوی غالباً علت المشائخ کا شکار تھا، اطہر حسین پر اس نے جبر کرنا چاہا، وہ نکل بھاگے، اور سلطان المدارس کے طلباء اور اساتذہ کو انہوں نے یہ واقعہ بتادیا۔ سارے طلباء نے متحد ہوکر اس مولوی کو ہٹانے کیلئے ہڑتال کر دی، جو چھ مہینے جاری رہی۔''(۱)

کیفی اعظمی سلطان المدارس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سلطان المدارس جس دن قائم ہوا تھا اسی دن اس کے سارے قاعدے قانون بن گئے تھے، اس میں حالات کے مطابق پھر کسی ترمیم و تنسیخ کو حرام سمجھا گیا تھا، میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر طالب علموں کی ایک انجمن بنائی، اور انجمن کی طرف سے طالب علموں کے کچھ مطالبے مرتب کر کے سلطان المدارس کے ارباب حل وعقد کے سامنے پیش کیے، اس کا جواب ہم کو یہ ملا کہ یہ انجمن ہماری مخالفت میں بنائی گئی ہے، ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے، اس لئے انجمن کو فوراً توڑ دو ورنہ................ انجمن بن چکی تھی................ہم کو کچھ ہی دنوں کے بعد اسٹرائیک کرنا پڑی .... ارباب اقتدار بوکھلا گئے انہوں نے نوٹس دیا کہ سلطان المدارس بند کیا جاتا ہے اور بورڈنگ بھی بند کیا جاتا ہے۔''(۲)

ہوسٹل کے کمروں کو طلباء نے یک زبان ہوکر خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ لاٹھی چارج ہوا کیفی اور ان

---

(۱) کیفی اعظمی کی تخلیقی فکر کا سفر۔ڈاکٹر قمر رئیس۔کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۱۲۴۔
(۲) میں اور میری شاعری۔کیفی اعظمی۔عکس اور جہتیں شاہد ماہلی۔معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔

کے چند ساتھی زخمی ہوئے لیکن حوصلہ نہیں ہارے یہ اسٹرائیک چلتی رہی اسٹرائیک کے دوران کیفی کا خاص کام احتجاجی نظمیں لکھنا اور مدرسے کے دروازے پر منعقد جلسوں میں جوش وخروش کے ساتھ پڑھنا تھا۔اسی دوران کیفی کی مختلف ترقی پسندوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور انہوں نے مولوی بننے کا خیال دل سے نکال دیا۔ بقول محمد ایوب واقف:

> ''اس طرح کیفی صاحب جو مولوی بننے کے لئے سلطان المدارس میں داخل ہوئے تھے، مولوی تو خیر نہ بن سکے البتہ کارل مارکس کے تیر کے (سے) گھائل ہو گئے اور اس طرح گھائل ہوئے کہ آج تک اس کا زخم باقی ہے۔''(۱)

یونیورسٹی کی تعلیم

یونیورسٹی میں تو کیفی داخلہ نہ لے سکے لیکن انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی سے اردو فارسی اور عربی کی پرائیوٹ سندیں ضرور حاصل کرلیں۔لکھنؤ یونیورسٹی سے انہوں نے مندرجہ ذیل اسناد حاصل کیں۔

۱-دبیر ماہر　　فارسی
۲-دبیر کامل　　فارسی
۳-عالم　　عربی

اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے انہوں نے مندرجہ ذیل امتحانات پاس کئے:

۱-اعلیٰ قابل　　اردو
۲-منشی　　فارسی
۳-منشی کامل　　فارسی

کیفی کی دلی تمنا تھی کہ وہ کسی کالج میں باقاعدہ داخلہ لے کر انگریزی کی تعلیم حاصل کریں لیکن ''من

---

(۱) میرا پڑوسی-محمد ایوب واقف　کیفی اعظمی-عکس اور جہتیں شاہد ماہلی-معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ء۔

در چہ خیالم وفلک در چہ خیال' کے مصداق سیاست اور شاعری کے جنون نے انہیں اس کا موقع ہی نہ دیا، وہ خود لکھتے ہیں:

''سوچا یہ تھا کہ یہ امتحانات پاس کر کے کسی کالج میں براہ راست ایف.اے. میں داخلہ لے لوں گا اور انگریزی پڑھوں گا لیکن جب تک سیاست اور شاعری کا جنون بہت ترقی کر چکا تھا آگے تعلیم حاصل کرنے کیلئے جس نظم وضبط کی ضرورت تھی میرا لاابالی پن اسے جھیل نہ سکا اور تعلیم ادھوری رہ گئی۔''(۱)

قیام لکھنؤ

عرصہ دراز سے لکھنؤ علم وادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا، یہاں کی آب وہوا میں شعروادب رچ بس گئے تھے، ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں یہیں ہوئی تھی، الہ آباد کے بعد ترقی پسندوں کا نیا گڑھ لکھنؤ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ سجاد ظہیر، سردار جعفری، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر، ڈاکٹر عبدالعلیم، سبط حسن، سلام مچھلی شہری، مجاز لکھنوی، علی عباس حسینی اور احتشام حسین وغیرہ لکھنؤ ہی میں مقیم تھے اور یہاں کے مختلف علمی اور ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پورے ملک میں ترقی پسندانہ خیالات پھیلانے اور ترقی پسند مصنفین کی شاخیں قائم کرنے میں مصروف تھے، کیفی کے والد نے لکھنؤ آکر ریاست بلہرہ کی تحصیل داری کی نوکری کر لی اور کچھ دنوں میں اپنی بیوی بچوں کو بھی لکھنؤ بلا لیا اور جب کیفی کی تعلیم کی بات آئی تو ان کو وہیں سلطان المدارس میں داخل کر دیا گیا۔ اس طرح کیفی کا لکھنؤ سے تعلق استوار رہا۔ کیفی سلطان المدارس میں تعلیم مکمل نہ کر سکے لکھنؤ میں رہتے ہوئے انہوں نے جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے اردو فارسی اور عربی کے کئی امتحانات پرائیوٹ طور پر پاس کئے ساتھ ہی ذاتی طور پر اپنا مطالعہ برابر بڑھاتے رہے۔ ترقی پسندوں سے کیفی کی ملاقاتیں ان کے طالب علمی کے زمانے ہی سے

---

(۱) میں اور میری شاعری۔کیفی اعظمی۔کیفی اعظمی۔عکس اور جہتیں شاہد ماہلی۔معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ء۔

ہو چکی تھیں مختلف ترقی پسندوں کا سلطان المدارس میں آنا جانا تھا، اس طرح کیفی نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی رکنیت قبول کر لی۔ اسی ضمن میں محمد ایوب واقف لکھتے ہیں:

''بارودخانے میں علی عباس حسینی کے مکان پر کیفی صاحب اور سید احتشام حسین کے مابین یہ پہلی ملاقات تھی اور اس پہلی ملاقات نے ہی کیفی اعظمی صاحب کے مستقبل کے پلان کا تعین کر دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ کیفی صاحب مرحوم احتشام حسین کی فرمائش پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔''(۱)

اب کیفی مکمل طور پر ترقی پسند شاعر ہو گئے تھے، اس دور میں انہوں نے بڑی جوشیلی نظمیں لکھیں جن میں باغیانہ جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، چنانچہ اس ترقی پسند رومانی شاعر (کیفی اعظمی) کو عشق کا ایسا تیر لگا کہ اس سے گھائل ہو کر انہیں لکھنؤ سے کانپور جانا پڑا، بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

''اس زمانے میں ایک عشق بلا خیز نے بھی انہیں اپنی آسیبی گرفت میں لے لیا کشمیری خاندان کی ایک لڑکی کو وہ ایم. اے. کی تیاری کیلئے اردو پڑھاتے تھے اسی طوفانی عشق کی آگ میں دونوں ہی جل بجھے۔ شرط یہ رکھی گئی کہ کیفی چھ مہینے کیلئے لکھنؤ سے باہر چلے جائیں اگر اس کے بعد بھی دونوں کا عشق قائم رہا تو شادی کر دی جائے گی لیکن یہ در اصل ایک چال تھی۔''(۲)

لہٰذا اس حادثے کے بعد کیفی کو لکھنؤ چھوڑ کر کانپور میں سکونت اختیار کرنا پڑی۔

کانپور میں کیفی کا قیام

کیفی غالباً ۱۹۴۱ء میں کانپور پہونچ گئے اس وقت کانپور شمالی ہندوستان میں مزدوروں کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ ۱۹۲۵ء میں کانپور ہی میں پہلی کیمونسٹ کانفرنس ہوئی تھی، جس کی مجلس استقبالیہ کے

---

(۱) میرا پڑوسی۔ محمد ایوب واقف۔ کیفی اعظمی۔ عکس اور جہتیں شاہد ماہلی۔ معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ء۔
(۲) کیفی اعظمی کی تخلیقی فکر کا سفر۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ کیفی اعظمی۔ عکس اور جہتیں شاہد ماہلی۔ معیار پبلی کیشنز دہلی۔

صدر حسرت موہانی منتخب ہوئے تھے یہاں آ کر مزدوروں کی تحریک سے کیفی بھی منسلک ہو گئے، کانپور میں کیفی کے ماموں ولایت احمد صاحب اور کیفی کے بڑے بھائی ظفر حسین صاحب رہتے تھے، ظفر حسین صاحب ملٹری اکاؤنٹ میں ملازم تھے، مگر کیفی ابتدا ہی سے شرمیلے اور فطرتاً آزاد منش اور تکلف پسند واقع ہوئے تھے، اس لئے اپنے کسی عزیز کے بجائے ایک دوست کے ساتھ رہنے لگے۔ یہیں کانپور میں کیفی کی پہلی ملاقات خلیل الرب سے ہوئی تھی اور پھر وہ ایک مدت مدید تک ان کے ساتھ رہے۔ اس صحبت کے تاثرات خلیل الرب اس طرح بیان کرتے ہیں:

''یہ بات ۱۹۴۱ کی ہے.................. میں نے اس نوجوان کو پہلی بار دیکھا تھا............ شاید وہ کانپور میں نووارد تھا۔ میں نے کسی اور کی زبانی بھی اس کا نام سنا تھا............ اس کی نظموں میں ترقی پسند خیالات واقدار کا فنکارانہ اظہار تھا۔ مجھے اس پر قدرے حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس نوعمری میں اس نے یہ قدرت کلام کیسے حاصل کر لی۔ میں نے اس نوجوان کے لئے اپنے دل میں کشش محسوس کی نشست کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے .... اس نوجوان کا قیام اب میرے ساتھ زیادہ رہنے لگا تھا۔ یہ فطرتاً کم گو تھا۔ اس نے اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔ یہ بھی کہ وہ کانپور میں کب کیوں اور کس مقصد سے آیا ہے، اس کے مشاغل کیا ہیں، میں نے بھی اس کے نجی حالات اور ذاتی معاملات کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔''(۱)

کیفی کو کانپور کی فضا بہت راس آئی یہاں آ کر انہوں نے اپنا مطالعہ اور وسیع کیا ساتھ ہی کئی مارکسی نوجوانوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔ اب انہوں نے مارکسی لٹریچر کو باقاعدہ پڑھا اور سمجھا۔

''کانپور میں سلطان نیازی، سید محمد مہدی، مونس رضا اور سنت سنگھ یوسف جیسے مارکسی نوجوانوں سے ان کی ملاقات ہوئی یہیں انہوں نے مارکسی لٹریچر پڑھا۔ سہارنپور سے نکلنے والا انقلابی پرچہ ''چنگاری'' وہ پہلے ہی پڑھتے تھے۔ اب ممبئی سے نکلنے

(۱) کیفی اعظمی۔ ذاتی تاثرات کے آئینہ میں۔ خلیل الرب کتاب نما ستمبر ۱۹۶۵ ص ۳۶۔

والا کمیونسٹ پارٹی کا اخبار ''قومی جنگ'' بھی پڑھنے لگے۔ فکر و عمل کا ایک وسیع میدان اب ان کے سامنے تھا۔'' (۱)

ایک طویل مدت کانپور میں گزارنے کے بعد ایک مشاعرے کے سلسلے میں کیفی لکھنؤ پہونچے اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نوجوانوں اور کامریڈوں سے کیفی کو متعارف کرایا جاسکے۔ کچھ دن لکھنؤ میں ٹھہرنے کے بعد کیفی یہاں سے ممبئی چلے گئے۔ ممبئی پہونچنے کا احوال خلیل الرب بیان کرتے ہیں:

''مشاعرہ جب ختم ہوا تو میرے کمیونسٹ ساتھیوں نے مجھ سے کہا کہ کیفی کو ہمیں دے دیجئے، میں نے پوچھا کیا کروگے بولے انہیں ممبئی بھیجیں گے۔ میں نے کہا پہلے اجازت منگوالو، چند روز کے بعد ممبئی سے اجازت آگئی اور ایک دن ہم لوگوں نے کیفی کو ریل میں بٹھا کر ممبئی کیلئے روانہ کردیا۔'' (۲)

کچھ لوگ اس بیان سے مختلف بات کہتے ہیں کہ ان دنوں سردار جعفری اور سجاد ظہیر لکھنؤ میں ہی تھے، سجاد ظہیر نے کیفی سے ممبئی چلنے کی فرمائش کی اور کیفی فوراً تیار ہوگئے اور پھر سردار جعفری اور سجاد ظہیر کے ساتھ ممبئی آگئے۔

ممبئی میں کیفی کا قیام

نوجوانوں کیلئے ممبئی ہمیشہ سے کشش رکھتا تھا۔ بالخصوص وہاں کی فلمی صنعت نوجوان شاعروں اور ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ لیکن ترقی پسند ادیب شاعر ممبئی کی جانب اس وجہ سے متوجہ ہوئے کیونکہ وہاں غریب لوگوں اور امیروں کا تضاد شرمناک حد تک تھا۔ ایک طرف شاندار محل اور خوبصورت کاریں اور دولت برسانے والے کارخانے تو دوسری طرف فٹ پاتھ پر سونے اور اسی طرح عمر گزارنے والے غریب نادار بھوکے پیاسے اور مختلف طرح کی بیماریوں میں گرفتار مزدور تھے۔ ترقی پسند ادیبوں نے کمیونسٹ پارٹی

(۱) کیفی اعظمی کی تخلیقی فکر کا سفر۔ قمر رئیس۔ کیفی اعظمی۔ عکس اور جہتیں شاہد ماہلی۔ معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔
(۲) کیفی اعظمی ذاتی تاثرات کے آئینہ میں۔ خلیل الرب کتاب نما ستمبر ۱۹۹۵ ص ۴۰۔

میں شامل ہوکر اس محروم طبقے کے افراد میں اپنے حقوق کی بازیافت کا شعور پیدا کرنا شروع کیا۔ ان کی انجمنیں بنائیں اور ان کے حقوق دلانے کیلئے جدوجہد کا راستہ دکھایا جب ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے اس شہر کو اپنا مرکز بنایا تو ملک کے گوشے گوشے سے ترقی پسند ادیب اور شاعر یہاں آ کر جمع ہونا شروع ہو گئے۔

> ''۱۹۴۳ء میں کیفی اعظمی نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے مرکزی دفتر ممبئی کی راہ پکڑی۔ یہاں انہوں نے ایک شاعر اخبار نویس کی حیثیت سے چالیس روپیہ ماہوار کی تنخواہ پر کام کیا۔''(۱)

کیفی کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی

ممبئی پہونچنے پر سردار جعفری، سید سجاد ظہیر، سبط حسن اور پی سی جوشی وغیرہ نے بھی کیفی کا استقبال کیا ان دانشوروں کی صحبت اور ساتھ کیفی کے ذوق مطالعہ ان کی فکر ونظر میں گہرائی پیدا کردی تھی۔ کیفی کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہوکر پارٹی کیمون میں داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں ممبئی میں ادبی سرگرمیوں اور انقلابی تحریکوں کا بہت زور تھا، کیفی کو یہ فضا بہت راس آئی یہاں انہیں وہ میدان عمل مل گیا، جس کے وہ متلاشی تھے، راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

> ''ممبئی آنے کے بعد کیفی مزدوروں میں رہنے لگے، انہیں شعر سناتے اور ان کے دکھ درد کو سنتے، ''قومی جنگ'' میں لکھتے اور ممبئی کی سڑکوں پر ''قومی جنگ'' بیچتے پھرتے۔''(۲)

ممبئی کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کرنے کے بعد کیفی کو غریبوں اور مزدوروں کی بستی ناگپاڑہ کی مقامی کمیٹی کے دفتر کا سکریٹری مقرر کردیا گیا۔ کیفی نے اپنے ساتھیوں کی طرح ناگپاڑہ کے مزدوروں کو متحد کرنے کا کام شروع کردیا۔ انہیں ان کی پسماندگی کا احساس دلانے کی کوشش کی، تفرقہ بازی اور آپسی

---

(۱) کیفی اعظمی۔علی سردار جعفری۔کیفی اعظمی۔عکس اور جہتیں شاہد ماہلی۔معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔

(۲) کیفی اعظمی راج بہادر گوڑ ص ۲۸۷۔کیفی اعظمی۔عکس اور جہتیں شاہد ماہلی۔معیار پبلی کیشنز دہلی۔

پھوٹ کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا اور پھر ان کے کاروبار کی مناسبت سے ان کی الگ الگ انجمن بنادیں، جیسے ریلوے مزدوروں کی انجمن، بندرگاہ کے مزدوروں کی انجمن، مختلف کارخانے کی انجمن وغیرہ۔ ان انجمنوں کے قیام سے رفتہ رفتہ ہر طبقہ میں جو استحصال کا شکار تھا اپنے حقوق کا احساس پیدا ہونا شروع ہوا۔ اس زمانے میں کیفی اپنی عمر اور سیاسی کارگزاریوں کے اعتبار سے عالم شباب پر تھے۔ ایک طرف وہ مزدوروں کسانوں اور مفلسوں کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے استحصال کے خلاف صف آرا کررہے تھے اور دوسری طرف ہندوستان کی آزادی کے لئے بھی جدوجہد میں مصروف تھے۔ کیفی کی اس دور کی شاعری ایک عظیم تاریخی اساس ہے، جس سے ان جذبات واحساسات کی ترجمانی ہوتی ہے، جن سے ترقی پسند تحریک دوچار تھی۔ کیفی کا پہلا مجموعہ ''جھنکار'' ۱۹۴۳ء میں شائع ہو چکا تھا اور ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کا کلام آخرشب کے نام سے شائع ہوا، جس میں وہ عملی اور ذہنی طور پر تحریک سے وابستہ نظر آتے ہیں۔

آزادی اور تقسیم ملک

بڑی جانکاہ جدوجہد کے بعد آزادی تو مل گئی مگر بھارت دو حصوں میں بٹ گیا۔ شروع میں دونوں ملکوں پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کا رویہ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ہمدردانہ رہا۔ پاکستان کا جاگیردارانہ نظام امریکی مقاصد کو حاصل کرسکنے کیلئے سازگار تھا ہی چنانچہ محمد علی جناح کے انتقال کے بعد امریکہ کو پاکستان کو روس کے خلاف صف آرا کرنے میں چنداں رکاوٹ نہ رہ گئی۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس میں کمیونزم کا الزام لگا کر سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کو گرفتار کرلیا گیا اور جمہوریت کے سبھی راستے مسدود کردئے گئے اور ہندوستان میں پنڈت نہرو نے حکومت کو سوشلسٹ نظریہ کے تحت چلا کر کمیونسٹ پارٹی کا زور ختم کردیا اور طرح طرح کے الزام عائد کرکے اس کے قانونی جواز کو ختم کردیا گیا۔ پی سی جوشی کی جگہ بی ٹی رondے صدر بنائے گئے پارٹی کے بہت سے کارکنوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ کچھ روپوش ہوگئے جو بچ گئے وہ دھیرے دھیرے پارٹی سے الگ ہونے لگے کمیونسٹ پارٹی کے زوال پذیر

ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک بھی انتہا پسندی کا شکار ہوگئی۔ آزاد ہندوستان کی نئی پالیسیوں کے تحت ترقی پسندوں بالخصوص کمیونسٹوں پر حکومت کا عتاب بڑھ گیا۔ کئی اراکین پارٹی گرفتار کر لئے گئے اور بچے کھچے روپوش ہوگئے، روپوش ہونے والوں میں کیفی بھی شامل تھے۔ لیکن ان حالات میں بھی وہ خاموش نہیں بیٹھے بلکہ پارٹی کے مفاد کیلئے کام کرتے رہے۔ اس زمانے میں عتاب پولیس سے بچنے کیلئے کیفی نے مونچھیں بڑھالی تھیں کہ آسانی سے پہچانے نہ جاسکیں اس ضمن میں خلش جعفری لکھتے ہیں:

> ''کیفی سے میری ملاقات اس انڈر گراؤنڈ حالت میں ہوئی تھی، وہ اپنی بیوی شوکت سے ملنے آئے تھے اور جب اسٹڈی سرکل میں مباحثہ ختم ہوگیا تو ہم چائے پینے کیلئے دوسرے کمرے میں گئے، جہاں ہمیں بتایا گیا یہ بڑی بڑی مونچھوں والے کامریڈ کیفی اعظمی ہیں۔''(۱)

کیفی اپنی روپوشی کے حالت میں کئی کئی مہینے شوکت سے نہیں مل پاتے تھے، شوکت کیفی کہتی ہیں:

> ''مجھے یاد ہے کہ جب کوئی کامریڈ چھپتے چھپاتے ہوئے مجھے ان سے ملانے لے جاتا تو میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگتا۔ کبھی کبھی مہینوں بعد ملنا ہوتا، ایک ماہ بعد اندھیری کے کسی گھر میں جب میں ان سے ملنے گئی۔ تو میں نے انہیں پہچانا نہیں انہوں نے مونچھیں رکھ لی تھیں، میں نے دیکھتے ہی کہا توبہ ہے کیا شکل بنالی ہے، بالکل پولیس کانسٹبل لگتے ہو کیفی ہنس کر کہنے لگے، اسی لئے تو جیل جانے سے بچا ہوا ہوں۔''(۲)

کیفی نے فلاح وقوم کے جو خواب دیکھے تھے وہ یکے بعد دیگرے چکنا چور ہوگئے۔ ہندوستان کی آزادی کا خواب تقسیم ملک کی صورت میں پورا ہوا اور زمانہ مہاجرت میں خوں ریزی کا جیسے سیلاب امنڈ پڑا، محبتیں نفرتوں میں بدل گئیں، کمیونسٹ پارٹی تقسیم ہوگئی، بیشتر کارکن جیلوں میں بھر دیئے گئے کچھ روپوش ہوگئے، جن کی تلاش جاری رہی، چین اور روس میں نظریاتی اختلاف پیدا ہوا اور ۱۹۶۲ء میں ہندوستان پر

(۱) کیفی اعظمی کچھ باتیں کچھ یادیں۔ خلش جعفری۔ کیفی اعظمی۔ عکس اور جہتیں شاہد ماہلی۔ معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ء ص ۲۴۶۔
(۲) کیفی اعظمی میرے ہم سفر۔ شوکت کیفی۔ کیفی اعظمی۔ عکس اور جہتیں شاہد ماہلی۔ معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ء ص ۶۳۔

چین کے اچانک حملے نے رہا سہا سکون درہم برہم کردیا۔ کیفی کی ساری عقیدتمندی مجروح ہوگئی اور اس طرح ان کے سجدے آوارہ ہوگئے ان سارے واقعات و کیفیات کا ذکر انہوں نے اپنی نظم ''آوارہ سجدے'' میں کھل کر کیا ہے۔ پھر بھی ان تمام تغیرات کے باوجود کیفی نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ بخوبی واقف تھے کہ جہاں کئی طاقتیں آپسی ٹکراؤ میں مبتلا ہوتی ہیں وہاں ارتقاء کا راستہ دشوار گزار ہوتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی تقسیم کے بعد کیفی نے یہ جان لیا تھا کہ معاشی انقلاب اب کمیونسٹ پارٹی کے بس کا روگ نہیں ہے اس احساس کے ساتھ انہوں نے نوجوانوں کی کئی انجمنیں بنائیں، جن سے عوام میں اتحاد میل محبت بھائی چارگی اور جوش وخروش پیدا کیا جاسکے، بقول اختر راہی:

''کیفی صاحب نے ایک عظیم مقصد کے تحت عوام کے تعاون سے کئی سماجی، ادبی تعلیمی اور تربیتی ادارے قائم کئے، مثلاً:

۱-عوامی ادارہ	مومن پورہ
۲-نوجوان پارٹی	کھیلا بائی اسٹریٹ
۳-شاہد لائبریری	مدن پورہ
۴-بخشی تعلیمی کمیٹی	مدن پورہ
۵-عوامی سنٹر	یعقوب اسٹریٹ
۶-عوامی مجلس	ڈونگری چھاچھ محلہ

''ان اداروں کے قیام کی جگہیں فری ریڈنگ روم کے لئے کتابیں اور فرنیچر کی فراہمی کوئی آسان اور معمولی کام نہ تھا مدن پورہ، ناگپاڑہ، یعقوب اسٹریٹ، ڈونگری اور مجگاؤں کے بااثر لوگوں نے بھی یقیناً اس کار عظیم کیلئے سرمایہ اکٹھا کیا ہوگا لیکن اس سرمایہ کا بیشتر حصہ کیفی صاحب نے اپنے حلقہ اثر سے فراہم کیا تھا۔''(۱)

---

(۱) کیفی صاحب جنہیں میں جانتا ہوں-اختر راہی-کیفی اعظمی-عکس اور جہتیں شاہد ماہلی-معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۴۰۹۔

ان اداروں کے علاوہ بھی کیفی صاحب نے نوجوان مصنفین کی ایک انجمن قائم کی، جس نے بے شمار ادبی سیاسی اور سماجی خدمات انجام دیں۔ کیفی انڈین پیوپلز تھیٹر ایسوسی ایشن یعنی IPTA سے نظریاتی طور پر پہلے سے وابستہ تھے لیکن ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء میں انہوں نے از سر نو تنظیم کا ذمہ لے کر کام کرنا شروع کیا۔ کیفی نے اپٹا کے حلقے کو وسیع کیا، جس سے بلراج ساہنی، بیتن سیٹھی، رمیش تلوار اور قادر خاں وغیرہ جیسے بہترین آرٹسٹ ڈائریکٹرز ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔

کیفی کے پاکستان کا سفر

اپنی اہلیہ کے ساتھ پہلی مرتبہ مئی ۱۹۷۷ء میں کیفی پاکستان گئے تھے۔ وہاں ان کا نہایت پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اس وقت کیفی کی والدہ فوت ہو چکی تھیں۔ لیکن کیفی کے بھائی اور چند بہنیں زندہ تھیں اس زمانے میں بھٹو صاحب سربراہ مملکت تھے پاکستان میں جگہ جگہ ہنگامے ہو رہے تھے۔ کیفی بایں ہمہ بدامنی اور انتشار کیفی کراچی میں مقیم رہے روزانہ کسی نہ کسی اخبار کے نمائندے ان سے انٹرویو لینے کیلئے حاضر رہتے تھے اور شام کو عزیزوں دوستوں شاعروں اور ادیبوں کے یہاں دعوتیں اور شعری نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ کیفی اور بیگم کیفی نے موہن جودڑو کی سیر کی وہاں کے عجائب گھر سے لطف اندوز ہوئے اور نہایت اطمینان سے قریب سوا ماہ بعد اپنے وطن واپس لوٹ آئے۔

دوسری مرتبہ ۱۹۸۴ء میں کراچی کے ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے کیفی اور شوکت کیفی ۳۰ر اپریل ۱۹۸۴ء دوسری مرتبہ کراچی پہونچے یہاں پہونچتے ہی ان کے پرستاروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا ایک کیا کئی مشاعرے اور شعری وادبی محفلیں منعقد ہوئیں۔ کیفی نے کسی سے انکار نہیں کیا، رات دن جاگتے، کلام سنتے اور سناتے رہے اس تکان سے کیفی کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں راج پھوڑے کی تکلیف جھیلنا پڑی۔ دوسرے تمام پروگرام اس بنا پر منسوخ کردئے گئے اور ۲۶ر مئی کو کیفی صاحب ممبئی کے لئے چل پڑے۔ یہاں آ کر انہوں نے اسپتال میں داخل ہو کر آپریشن کرالیا۔ مہینہ بھر اسپتال میں رہے پھر ڈسچارج

ہوکر گھر چلے آئے کیفی کئی مہینوں بعد پھر ٹھیک ہو گئے۔ ایک سال بعد ہی یعنی ۱۹۸۵ء میں ایک عالمی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے پاکستان گئے، جہاں ہندوستان سے کئی شاعر آ گئے تھے کیفی بھی ان کے ساتھ تھے، اس بار کیفی کی بیگم ان کے ہمراہ نہ تھیں بلکہ ان کے PA ذاتی مددگار شفیق صاحب تھے کیفی نے وہاں کئی مشاعروں اور جلسوں میں شرکت کی اور دو ہفتہ پاکستان میں رہ کر ۲۰ رمئی کو ممبئی لوٹ گئے اس کے بعد مارچ ۱۹۹۹ء میں ارتقاء کی طرف سے منعقدہ عالمی جوش سیمینار اور مشاعرے میں شرکت کی غرض سے کیفی نے پاکستان کا ایک اور سفر کیا۔

اپنے وطن مجواں کی طرف کیفی کی مراجعت

کیفی کی شہرت و مقبولیت کی واحد یہ وجہ نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو مسائل حیات وسماج و ملک کے ذکر تک محدود کیا۔ وہ عملی طور سے ان مسائل کی تلاش میں بھی پیش پیش تھے، کیفی کو اپنی ماتر بھومی (مولد) سے بہت پیار تھا اور وہ اپنے گاؤں کی ترقی کیلئے ہمہ تن فکر مند رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کے کچھ ابتدائی دن چھوڑ کر باقی چالیس سال کے قریب ممبئی میں نہایت فراغت کے دن گذارے جب گاؤں میں آ کر دیکھا تو ان کا دل رو اٹھا کیونکہ یہاں ترقی کا کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ نہ سڑک تھی، نہ اسپتال نہ اسکول اور نہ ڈاک خانہ۔ چنانچہ انہوں نے گاؤں کی ترقی کیلئے کمر باندھ لی سب سے پہلے وہ پھول پور ریلوے اسٹیشن سے مجواں تک سڑک بنوانے کی فکر میں لگ گئے ہر نئے کام کے آغاز کے شروع میں اکثر مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے کیفی کی بھی جم کر مخالفت ہوئی، کیفی گاؤں کے فرداً فرداً ہر شخص سے ملے ان کو اچھی سڑکوں کے فوائد سے آگاہ کیا اور رفتہ رفتہ ان سب کو اپنا ہم آواز بنا لیا آخر کار تین کلومیٹر لمبی ڈامر روڈ بنوا کر دم لیا۔ آج بھی اس روڈ کو عوام کیفی روڈ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ حالانکہ اس سڑک پر کہیں ان کے نام کا کوئی پتھر نصب نہیں ہے اسی سڑک کی تعمیر کیلئے کوشش میں کیفی لکھنؤ میں مقیم تھے ایک حادثہ میں ان کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

لکھنؤ میں کیفی ہمیشہ ہوٹل گلمرگ میں ٹھہرا کرتے تھے ۱۹۷۸ء میں جب وہ لکھنؤ میں سڑک بنوانے کی فکر میں اور اپنے باغ میں کیلے کے پودے لگوانے کی کوششوں میں مصروف تھے تو ہوٹل کی سیڑھیوں سے ان کا پیر پھسل گیا اور ان کے بائیں پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی شوکت کیفی لکھتی ہیں:

''گاؤں کی سڑک بنوانے کے سلسلے میں چیف منسٹر اتر پردیش رام نریش یادو سے صبح سات بجے ملنے گئے واپسی میں اس بارے میں سوچتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ پیر پھسل گیا اور گر پڑے۔ پیر کے جڑھے کی ہڈی تین ٹکڑے ہوگئی اٹھ نہیں سکے، لوگوں نے پکڑ کر بڑی مشکل سے اٹھایا.......... کیفی فوراً میڈیکل کالج پہونچائے گئے ایکسرے ہوا معلوم ہوا کہ ران میں تین جگہ سے ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔''(۱)

اس دوران ان کے پیٹ میں بھی ہیمریج ہوگیا تھا جو کچھ وقت کے بعد ٹھیک ہوگیا تھا تین چار روز بعد ڈاکٹر گوئل نے انہیں بے ہوش کر کے بغیر آپریشن کے ہڈی جوڑ دی اور پھر پیر کو ٹریکشن Traction میں ساڑھے چار مہینے کیلئے رکھ دیا گیا کیفی ساڑھے چار مہینے چت لیٹے رہے بیٹھنا یا کروٹ لینا منع تھا، اسی ٹریکشن کی حالت میں جب لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد ہوا تو کیفی نے لیٹے ہوئے ایک نظم کہی ''لکھنؤ تو نہیں'' یہ عرصہ گذرا اور کیفی اپنی قوت ارادی ڈاکٹروں کی محنت اور لگن سے ایک بار پھر چلنے کے قابل ہوگئے۔

مجواں کی ترقی کیلئے کیفی کی جدوجہد

کیفی کو اپنی مادر وطن مجواں سے محبت صحیح معنوں میں نصف الایمان کی حیثیت رکھتی ہے اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی پرائمری اسکول تک نہ تھا کیفی کی کوششوں سے یہاں پہلے پرائمری اسکول قائم ہوا جو آگے بڑھ کر ہائی اسکول تک ہوگیا، گاؤں والوں کا ذوق جہالت اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھانے کے حق میں نہیں تھے اس لئے اسکول کا کوئی جواز ان کی نگاہ میں نہیں تھا۔ ان کا مقصد حیات صرف

(۱) کیفی میرے ہم سفر۔شوکت کیفی۔کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲، ص ۷۶۔

اس حد تک محدود تھا کہ ان کے ہوش سنبھالنے کے بعد کھیتی باڑی میں ان کا ہاتھ بٹائیں، جانور چرائیں، اور بس۔ کیفی نے ہمت نہیں ہاری باوجود مایوسیوں کے بار بار ہاتھ لگنے کے وہ برابر افہام وتفہیم میں لگے آخر کار ان کی محنت بارآور ہوئی اور وہ بچوں کو اسکول بھیجنے لگے۔ اس چھوٹے سے قریہ میں اب اندازاً پانچ چھ سو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں کیفی کی کوششوں سے حکومت نے ٹیلی ویژن سیٹ بھی مہیا کرا دیئے اور لڑکیوں کے کمپیوٹر سیکھنے کیلئے ٹریننگ سنٹر بھی کھلوا دیا، مجواں میں نہ ڈاکٹر تھا، نہ اسپتال اس لئے گاؤں کے نادار لوگ اکثر چھوٹی بیماریوں سے بھی جاں بحق ہو جاتے تھے، اب وہاں چھ بستروں کا چھوٹا سا سرکاری اسپتال ہے یہ بھی کیفی کی ہی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ اسپتال میں زچہ بچہ کی بروقت مدد کیلئے تربیت یافتہ لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں ہیں۔ اتنا ہی نہیں صرف کیفی کی کوششوں سے مجواں میں بجلی کی سہولت مہیا ہوئی اور ڈاکخانے کا قیام عمل میں آیا۔ ان تمام کاموں کیلئے کیفی کو کتنے ہفت خواں سر کرنا پڑے ہوں گے اس کا صحیح اندازہ تو کیا ہو سکے گا ہاں یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ سارے کام ایک مرد آہن کے ہی بس کے ہو سکتے ہیں، جس کے قدم غیر متزلزل ہوں کیفی کو اس کام کے سلسلے میں لکھنؤ کے کئی بار چکر لگانے پڑے، اس سلسلے میں شبانہ اعظمی کہتی ہیں:

> ''گذشتہ دس برسوں میں ان کی انتھک کوششوں کی وجہ سے اب اس چھوٹے سے گاؤں میں سڑک ہے، بجلی ہے ایک چھوٹا سا چھ بستروں والا اسپتال ایک اسکول ہے، پوسٹ آفس ہے اور یہ سب حاصل کرنا ایک چھوٹے سے گاؤں کیلئے آسان نہیں تھا۔ ایک ایک قدم پر انہیں مخالفتوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا (سرکار اور سرکاری افسروں سے کوئی کام کروالینا اتنا آسان نہیں ہوتا، جتنا کہ جوئے شیر لانا، اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا، ابا میں لوگوں کو منظم کرنے اور ان کی رہنمائی کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔'' (۱)

آج اہل مجواں پر یہ بات روشن ہو چکی کہ زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کے چلے جانے سے سڑک کی

---

(۱) کیفی میرے ابا- شبانہ اعظمی- کیفی اعظمی عکس اور جہتیں- شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲، ص ۷۶۔

تعمیر بہت زیادہ قیمتی ہے، کیفی نے پانچ ایکڑ زمین پر اچھی قسم کے آم کا باغ لگوایا ان کے پودے وہ خود ملیح آباد اور لکھنؤ جا کر چن کر لائے تھے، ان آموں کو دیکھتے ہوئے یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مجواں کی ساری ترقی اور خوشحالی صرف اور صرف کیفی اعظمی کے خلوص اور ان تھک محنتوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔

کیفی یہیں پر تھک کر نہیں بیٹھے انہوں نے اپنی بیگم شوکت کیفی کے بھرپور تعاون سے مجواں ویلفیر سوسائٹی بنائی اور اسے رجسٹرڈ بھی کرایا۔ کیفی کا مقصد تھا کہ کوئی گاؤں والا بیکاری کا شکار نہ ہو۔ کم عمر بچوں کیلئے اسکول قائم کئے اور ساتھ ہی بڑوں کیلئے مجواں ویلفیر سوسائٹی قائم کی، جہاں وہ طرح طرح کے فن سیکھ کر اپنے لئے سامان مشغولیت اور معاشی فراغت حاصل کرسکیں۔ اس سوسائٹی میں اطراف وجوانب کے دیہاتوں کے لوگ شامل تھے، جہاں ان کو صابن بنانا، سائیکلوں کی سیٹیں بنانا، بچوں کو ٹائپ سکھانا، اور بنارسی کپڑا بنانا جیسے ہنر سکھائے جاتے۔ اس مقصد کے تحت پہلے کیفی نے گاؤں کے لڑکوں کو شہر بھیج کر انہیں مختلف فنون کی تربیت دلوائی تھی اب یہ کام مجواں میں ہونے لگا۔ کیفی کی لائق بیٹی شبانہ اعظمی نے اپنے والد کے نقش قدم کو مشعل ہدایت سمجھا اور مجواں کے وسط سے چار کلومیٹر لمبی سڑک بنوائی، جس سے شہر آنا جانا آسان ہوگیا آج یہ شبانہ روڈ کے نام سے مشہور ہے۔

کیفی اعظمی اور شبانہ اعظمی نے یوپی کے وزیر اعلیٰ اور گورنر اتر پردیش کے ہاتھوں ایک ڈگری کالج کا سنگ بھی رکھوادیا ہے اس کالج کا مجوزہ نام کیفی اعظمی گرلس ڈگری کالج ہوگا۔

شادی اور ازدواجی زندگی

کیفی کی شادی کا قصہ کچھ اس طرح سے ہے کہ وہ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد گئے اور اختر حسین ایڈیٹر روزنامہ ''پیام'' کے یہاں ٹھہرے تھے۔ اختر حسین ترقی پسند خیالات کے حامی تھے اور ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی بے حد خاطر کرتے تھے۔ اس سفر میں سردار جعفری اور مجروح سلطانپوری بھی کیفی کے ساتھ تھے۔ اختر حسین کی چھوٹی سالی شوکت خانم جن کا گھریلو نام موتی تھا، سے کیفی کی ملاقات ایک

مشاعرے میں ہوئی اور یہیں کیفی اور موتی دونوں ایک دوسرے پر ریجھ گئے، بقول سردار جعفری:

''کیفی کو ان کے حسن نے اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ خود ان کی خوبصورت شاعری اور پڑھنے کے زوردار انداز کی طرف راغب ہوئیں۔''(۱)

دونوں کے اس تصادم نگاہ نے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اول اس وجہ سے کہ شوکت کی شادی طے ہو چکی تھی اور دوئم اس وجہ سے کہ کیفی کے کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے شوکت خانم کے گھر والے کیفی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شوکت کو بہت سمجھایا بجھایا گیا مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہیں۔ شوکت کے والد ایک روشن خیال تھے انہوں نے بیٹی کی پسند کو اولیت دیتے ہوئے پہلے کے طے شدہ رشتہ کو توڑ دیا اور شوکت کو حیدرآباد لے کر چلے گئے۔ سجاد ظہیر نے ان حالات کا بخوبی مطالعہ کیا اور گھر بلا کر تمام ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی موجودگی میں شوکت خانم کا نکاح ۲۳رمئی ۱۹۴۷ کو کروادیا۔ شوکت خانم اس نکاح کا واقعہ یوں بیان کرتی ہیں:

''نکاح میں یہ مشکل تھی کہ لڑکا شیعہ تھا اور لڑکی سنی۔ نکاح کیلئے بھی دو قاضیوں کی ضرورت تھی جن کا بلانا مشکل تھا، جب قاضی نے پوچھا ''لڑکے کا مذہب'' بنے بھائی (سجاد ظہیر) مسکرا کر بولے ''حنفی المذہب'' بس نکاح ہو گیا۔ چاروں طرف سے مبارکباد کی آوازیں آنے لگیں اور نہایت دلچسپ مشاعرہ شروع ہو گیا۔ جوش، مجاز، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، سکندر علی وجد سب نے اپنی اپنی خوبصورت غزلیں سنائیں اور شادی کی محفل کامیاب ہوئی۔''(۲)

اسی شادی کی محفل کے بارے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

''ایک سادی سی شادی کی رسم ۶۹ سیکری بھون میں مکمل ہوئی، یہ سجاد ظہیر کا گھر تھا، جہاں ترقی پسند ادیبوں کی میٹنگیں ہوا کرتی تھیں شادی پر کل سو روپیہ خرچ ہوئے، جس میں قاضی جی کی فیس بھی شامل تھی، دلہن کو جو واحد تحفہ ملا وہ تھا کیفی صاحب کی نئی کتاب کی

---

(۱) کیفی اعظمی، سردار جعفری-کیفی اعظمی عکس اور جہتیں-شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲، ص ۷۶۔
(۲) کیفی اعظمی، میرے ہم سفر-شوکت کیفی-کیفی اعظمی عکس اور جہتیں-شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲، ص ۷۶۔

پہلی جلد ''آخرِ شب'' عنوان کا یہ مجموعہ شوکت کے نام تھا۔ انتساب میں لکھا تھا ''ش کے نام

''میں تنہا اپنے فن کو آخرِ شب تک لے آیا ہوں، تم آ جاؤ کہ سحر ہو جائے۔'' (۱)

یہ واحد تحفہ آخرِ شب کی شکل میں سردار جعفری ہی نے شوکت کو پیش کیا تھا، رفعت سروش اپنی خود نوشت ممبئی کی بزم آرائیاں میں سجاد ظہیر کے مکان کا ذکر کرتے ہوئے کیفی کی شادی کے متعلق لکھتے ہیں:

''اور کیفی کی تو شادی ہی اس مکان میں ہوئی تھی، شوکت کا وہیں نکاح ہوا تھا اور وہیں دلہن بنیں اور کافی دن تک اس گھر میں رہیں۔ یہ آزادی سے کچھ ماہ پہلے کی بات ہے...... شوکت اپنے بہنوئی اور پیام ایڈیٹر اختر حسین کے ساتھ ۶۹ والیکشور روڈ آ کر اتریں اور باقاعدہ نکاح کی رسم ادا کی گئی اس نکاح میں بخاری صاحب (ذوالفقار بخاری) بھی موجود تھے، اور ممبئی کے سبھی ادیب تھے، خوب چہل پہل تھی۔'' (۲)

شادی ہو جانے کے بعد کیفی نے اپنی بیوی کے ساتھ محلہ اندھیری کیمون ممبئی میں ایک کمرے میں گزارے اور جب کیمون خالی کرنا پڑا تو ناگپاڑہ ممبئی کے ایک کوٹھری نما کمرے میں کئی سال تک معمولی زندگی بسر کرتے رہے۔ اپنا گھر چلانے کے لئے کیفی اور شوکت کو بہت زیادہ قربانیاں دینا پڑیں۔ پارٹی مصروفیت کے علاوہ کیفی اکثر اخباروں کے لئے مزاحیہ نظمیں لکھتے، ادارت کی ذمہ داری نبھاتے، تو بعض اوقات فلموں کی ڈبنگ میں بھی شرکت کرتے، شوکت بھی انڈین پیوپلز تھیٹر اور پرتھوی تھیٹر میں کام کرتی تھیں رفتہ رفتہ اسی طرح دن گزرتے رہے اور کسی نہ کسی جتن سے دن گزرتے رہے پھر کیفی کو فلموں میں کام ملنے لگا اور پریشانیوں کے بادل چھٹنے لگے۔ ان تمام حالات کے باوجود کیفی کی ازدواجی زندگی اچھی رہی دونوں پارٹی میٹنگوں میں شریک ہوتے اور جلوس میں میلوں پیدل چلتے، نعرے لگاتے، زن و شوہر میں اعتماد محبت و عزت احترام میں کمی کبھی نہیں ہوئی۔ شوکت خانم اپنی ازدواجی زندگی کی جھلک یوں پیش کرتی ہیں:

''شادی سے پہلے ایک بار میں نے کیفی کے سامنے ایک پیپر پر لکھ دیا تھا کہ''

---

(۱) کیفی اعظمی سردار جعفری کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۴ ص ۲۰۰۔
(۲) ممبئی کی بزم آرائیاں۔ رفعت سروش ص ۶۶ ادارہ فکر جدید دہلی ۱۹۸۶۔

اگر زندگی کے اس طویل سفر میں تم میرے ہم سفر ہو جاؤ تو یہ زندگی اس طرح گزر جائے، جس طرح پھولوں پر سے نسیم سحر کا لطف جھونکا'' اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ زندگی کے انتہائی اتار چڑھاؤ کے باوجود ایک کمرے کی زندگی کبھی کھانا ہے کبھی نہیں کے باوجود میں نے اپنے ماں باپ کو شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا میں نے کبھی اپنے آپ کو دکھی نہیں محسوس کیا، میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک انتہائی خوش قسمت عورت سمجھا اور آج بھی سمجھتی ہوں شاید میرے ہی لئے کیفی موت کی دہلیز کو چھو کر واپس آ گئے۔''(۱)

کیفی کی ازدواجی زندگی نہایت خوش خوش گزری کبھی لڑتے جھگڑتے غصہ گرمی کرتے دونوں نہیں دیکھے یا سنے گئے، بقول خلش جعفری:

''کیفی دراصل کسی فرد سے جھگڑا کر ہی نہیں سکتے تھے اب بھی نہیں کر سکتے میں نے گھر میں کبھی ان کو چیختے چلاتے نہیں سنا گھر میں تو ہمیشہ موتی آپا کی آواز ہی گونجا کرتی تھی ہاں جلسوں اور مشاعروں میں کیفی خوب گرجتے تھے اور پورے انقلابی نظر آتے تھے۔''(۲)

''کیفی کو بچوں سے بہت لگاؤ تھا اس کی ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ اپنی بیماری کے دوران جب ان کا ایک ہاتھ اور پیر مفلوج ہو گیا تھا اور اسی حالت میں گر جانے سے ان کے پیر کی ہڈی کئی جگہ سے ٹوٹ گئی اور کیفی کو لگ بھگ ساڑھے چار مہینے بالکل چت لیٹے رہنا پڑا تھا اسی زمانے میں شوکت کے بھانجے ارشاد احسن کے دو سال کے بیٹے ساگر کے بارے میں نہایت فکرمندی میں شوکت سے کہنے لگے ملاحظہ کیجئے، اس جملے میں کتنا کرب اور مایوسی ہے: ''میں ساگر کا ہاتھی کبھی نہیں بن سکوں گا۔''(۳)

---

(۱) کیفی اعظمی میرے ہم سفر شوکت کیفی - کیفی اعظمی فن اور شخصیت - شاہد ماہلی ص ۵۳ معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء۔

(۲) ''اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ'' کیفی اعظمی: کچھ یادیں کچھ باتیں - خلش جعفری فن اور شخصیت - شاہد ماہلی ص ۲۳۳، معیار پبلی کیشنز ۲۰۰۴۔

(۳) کیفی اعظمی سردار جعفری کیفی اعظمی عکس اور جہتیں - شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۴ ص ۷۸۔

غرضکہ ان کی ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار گزری۔

شوکت خانم ایک تعارف

کیفی کی اہلیہ شوکت خانم عرف موتی ایک معزز سنی العقیدہ گھرانے کی فرد تھیں ان کے والد محمد یحییٰ خاں ریاست حیدرآباد کے سرکاری ملازم تھے، شوکت تعلیم یافتہ روشن خیال ہونے کے ساتھ بہترین تھیٹر اداکارہ بھی تھیں۔ انہوں نے اسکول سے پرتھوی تھیٹر، اپٹا یعنی انڈین پیوپلز تھیٹر ایسوسی ایشن اور چند فلموں میں یادگار کردار ادا کئے تھے، ان کی پرورش عیش وعشرت کے ماحول میں ہوئی تھی لیکن کیفی سے شادی کے بعد جب کیفی کی آمدنی صرف ۴۵ روپیہ ماہوار تھی اور گزر بسر اس قلیل آمدنی میں کٹھن مرحلہ تھا اسی وقت شوکت کو گھر میں بیٹھا رہنا اچھا نہیں لگا اس لئے گھر کی آمدنی بڑھانے کے خیال سے انہوں نے پرتھوی ٹھیٹر میں سو روپیہ ماہوار پر ملازمت کرلی۔ جہاں انہیں چھوٹے موٹے رول ادا کرنا ہوتے تھے۔ شوکت نے اپنی جدوجہد اس وقت بھی اسی طرح جاری رکھی، جب ان کی بیٹی شبانہ صرف دو تین ماہ کی تھی۔ وہ اسے گود میں لیکر پرتھوی تھیٹر جاتیں، ریہرسل میں دقت ضرور ہوتی، پرتھوی راج بھی یہ محسوس کرتے اور دیکھتے لیکن وہ کبھی ناراض یا غصہ نہیں ہوتے۔ شوکت نے ۱۹۵۷ تک چھ سال پرتھوی تھیٹر میں ملازمت کی۔ پرتھوی راج کپور کے ساتھ ڈراموں میں کام کیا اس کے ساتھ وہ اپٹا سے بھی وابستہ رہیں۔ انہوں نے ریڈیو اور فلموں میں بھی کام کیا ان کی خاص فلم ہے "گرم ہوا" لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے مکالمے اور کہانی کیفی ہی نے لکھی تھی۔ غرضکہ شوکت کیفی ایک وفا شعار بیوی ایک اچھی ماں اور کامیاب تھیٹر آرٹسٹ، سچی وطن پرست اور ذمہ دار شہری ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہیں اپنے ملک سے اتنا ہی پیار ہے، جتنا اپنے شوہر کیفی یا بیٹی شبانہ اعظمی سے۔

کیفی کی اولاد

کیفی کا پہلا بچہ ۱۹۴۹ میں پیدا ہوا تھا، یہ زمانہ کیفی کی انتہائی عسرت اور تنگدستی کا تھا، ایک دفعہ بیمار

ہوگیا اور پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا علاج نہ ہو سکا اور بچہ فوت ہوگیا، شوکت کیفی بیان کرتی ہیں:

''کیفی رات دن کام کر رہے تھے ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا میں اتنی خوددار ہوں کہ کبھی اپنے ماں باپ سے بھی ایک پیسہ نہیں مانگا پھر انہیں دنوں میرا بچہ بیمار ہوگیا اس کا ہومیو پیتھک علاج کراتی رہی جس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور بچہ تیرہ دن کی بیماری کے بعد چل بسا۔ ٹائیفائیڈ نمونیہ ہوگیا تھا۔''(۱)

اس بچے کے تقریباً ایک سال بعد یعنی ۱۸ ستمبر ۱۹۵۰ کو شبانہ اعظمی کی ولادت ہوئی، انہوں نے کوئن میری ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کر کے سینٹ زیویر کالج سے بی اے پاس کیا پھر پونہ فلم انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے کر اداکاری سیکھی اور اس اداکاری کے بل پر کئی نیشنل انعام حاصل کئے اور اس طرح فلمی دنیا میں اپنی ایک خاص شناخت قائم کرلی۔ شبانہ ایک سماج سیویکا (سوشل ورکر) بھی ہیں۔ ایک ایم. پی کے روپ میں ملک وقوم کے خدمت میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے والد کیفی اعظمی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

''جب بھی میں نے ابا کی رہنمائی پر بھروسہ کیا مجھے کامیابی ملی ہے، مجھے یقین ہے کہ جب تک میرے سر پر ابا کا ہاتھ ہے اور جب تک ان کے شعور کا سرمایہ میرے پاس ہے زندگی کے دشوار سے دشوار موڑ پر بھی مجھے کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔''(۲)

شبانہ کی شادی جاں نثار اختر کے بیٹے جاوید اختر کے ساتھ ہوئی، جو فلم کے بہترین اسکرپٹ رائٹرس میں سے ایک ہیں، وہ اچھے گیت کار اور شاعر بھی ہیں، کیفی کے بیٹے احمر اعظمی عرف بابا اعظمی نے پونہ فلم انسٹی ٹیوٹ سے فوٹوگرافی کی تعلیم حاصل کی آج وہ کامیاب فوٹوگرافر ہیں، بابا اعظمی نے اداکارہ اوشا کرن کی بیٹی تنوی سے شادی کی، تنوی ایک مشہور اداکارہ ہیں۔

---

(۱) کیفی اعظمی میرے ہم سفر۔ شوکت کیفی۔ کیفی اعظمی فن اور شخصیت۔ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ ص ۴۹۔
(۲) کیفی اعظمی میرے ابا شبانہ اعظمی کیفی اعظمی فن اور شخصیت۔ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ ص ۲۷۔

کیفی کے احباب

کیفی کا حلقہ احباب وسیع ہے اس میں ہر مذہب وعقیدے کے لوگ شامل ہیں، جن کی خبر رکھنا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے، وہ اپنے دوستوں کی خبر گیری کرتے اور دوستوں کو پہچاننے میں مہارت رکھتے تھے وہ اپنے تعلقات کو وسیع کرنے میں بڑی ہوشمندی کا ثبوت دیتے تھے بہت ہی احتیاط سے قدم اٹھا کسی کو اپنا دوست کہتے اس بات کا لحاظ رکھتے کہ دوست سے ان کی ذہنی مناسبت بھی ہو، لیکن فطرتاً کم سخن تھے لیکن محفل احباب میں خوش گپیاں کرتے اور دلچسپ لطائف سے محفل کو قہقہہ زار بنا دیتے تھے۔

''وہ دوستوں کے دوست ہیں مخالفین اور دشمنوں کے بھی بدخواہ نہیں'' (۱)

''کیفی صاحب اتنے کم گو اور کم آمیز مشہور ہیں کہ ان کی مقبولیت اور ان کے اطراف میں جمع لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات مشہور کیوں ہوگئی۔'' (۲)

''ان کے دوست بے شمار ہیں کیفی صاحب کم گو ہیں، کیفی ان کے اطراف ان کو سمجھنے اور ان کو چاہنے والوں کا ہجوم رہتا ہے کیفی صاحب تنہائی پسند ہیں لیکن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سے لیکر کیمونسٹ پارٹی پھر اپٹا کے ہر ہنگامے اور ہر سرگرمی میں کیفی صاحب سرگرم رہتے ہیں۔'' (۳)

کیفی کے لکھنؤ میں قیام کے زمانے میں ان کے تعلقات ترقی پسندوں سے استوار ہو گئے تھے، جن کے اسماء ہیں علی عباس حسینی، سید احتشام حسین علی سردار جعفری اور سجاد ظہیر، کیفی کی ان سے ملاقاتیں ہوتیں اور ان حضرات کے ہمراہ اکثر محافل جمع ہوتیں اور سجتی تھیں اور کانپور میں قیام کے دوران ان

---

(۱) کیفی صاحب کچھ یادیں کچھ باتیں۔خلش جعفری۔کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۲۵۸۔
(۲) کیفی صاحب دوئم مسکراہٹ کا نام عزیز قیسی کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۲۰۷۔
(۳) کیفی صاحب دونیم مسکراہٹ کا نام عزیز قیسی۔کیفی اعظمی عکس اور جہتیں۔شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۲۱۵۔

کے حلقہ احباب میں خلیل الرب، قاضی جلیل عباسی، سلطان نیازی، سید محمد مہدی، مونس رضا اور سنت سنگھ یوسف شامل تھے۔

ممبئی کے کیفی کے احباب کا ذکر کرتے ہوئے خلیل الرب لکھتے ہیں:

"ممبئی پہونچنے پر سجاد ظہیر، سبط حسن، سردار جعفری، پی سی جوشی اور کمیونسٹ پارٹی کے دوسرے کارکنوں نے کھلے آغوش سے کیفی کو گلے لگایا۔"(۱)

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ کیفی کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقت کارکن تھے ان کی رہائش کمیون میں تھی۔ اس لئے انہیں یہاں ہندوستانی معاشرے اور تہذیب کے پروردہ اور ادبی دنیا کے اکابرین سے ملنے کا موقع ملا۔ اردو شاعر جوش ملیح آبادی، ہندی شاعر سمترا نندن پنت، ملیالم کے مشہور شاعر اور کتھا کلی کے ترجمان دِلّے تول مراٹھی ڈرامہ نویس ماما وریکر، مشہور رقاص اودے شنکر فلم اداکار کے ایل سہگل اور پرتھوی راج کپور اور ایسی بہت سی عظیم ہستیاں پارٹی کے مرکزی دفتر میں آتی رہتی تھیں۔ بار بار کی ملاقات کی بنا پر کیفی کے ان سبھی سے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں میں شریک ہونے کی وجہ سے انہیں مختلف شہروں میں بھی جانا پڑتا تھا اس لئے اور بھی ان کا دائرہ احباب اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ان کی مکمل فہرست پیش کرسکنا تو امر محال ہے لیکن چند اہم دوستوں کے نام:-

سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطانپوری، کرشن چندر، سید محمد مہدی، شاہد لطیف، عزیز قیسی، محمد ایوب واقف، اختر راہی، رفعت سروش، عبدالجبار وغیرہ۔

کیفی کی تصنیفات

۱- پہلا مجموعہ کلام	جھنکار	۱۹۴۳
۲- دوسرا مجموعہ کلام	آخر شب	۱۹۴۷

(۱) کیفی اعظمی خلیل الرب کتاب نما دہلی ستمبر ۱۹۹۵ص ۴۰۔

۳-تیسرا مجموعہ کلام	آوارہ سجدے	۱۹۷۳
۴-چوتھا مجموعہ کلام	میری آواز سنو (فلمی گیت)	۱۹۷۴
۵-ساحرلدھیانوی	ساحر کی شخصیت اور فن پر ایک طویل خاکہ	۱۹۴۸
۶-ابلیس کی مجلس شوریٰ دوسرا اجلاس		۱۹۷۷
۷-سرمایہ (کل انتخاب)	اس مجموعہ میں جھنکار، آخر شب، آوارہ سجدے کا منتخب کلام اور اقبال کی مجلس شوریٰ اور کیفی کی ابلیس کی مجلس شوریٰ دوسرا اجلاس بھی شامل ہے۔	
۸-آوارہ سجدے	مرتبہ ڈاکٹر ضیاء فاطمہ زیدی دیوناگری رسم الخط میں مقدمہ شمشیر بہادر سنگھ	۱۹۸۰
۹-آوارہ سجدے	(ہندی کا دوسرا ایڈیشن) جس میں جھنکار اور آخر شب کا منتخب کلام شامل کیا گیا ہے۔	۱۹۹۰
۱۰-سرمایہ ہند (ہندی میں)	شاہد ماہلی	۱۹۹۹
Selected poems of Kaifi Azmi-۱۱	پون کمار ورما (کیفی اعظمی کی منتخب شاعری کو پون کمار ورما نے انگریزی قالب میں ڈھالا) (اس کے ناشر پینگوئن پبلشرز ہیں)	۲۰۰۱

ان کے علاوہ کیفی کے متعدد مضامین فلمی ڈرامے، کہانیاں اور لکچرز بھی ہیں، جو مختلف رسائل اور جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ کیفی کافی دنوں تک اردو بلٹز میں ''نئی گلستاں'' کے عنوان سے طنزیہ کالم لکھتے رہے ہیں، جن میں ان کا خاص طنزیہ انداز عصری حالات و مسائل پر چبھتے ہوئے فقروں اور جملوں

میں طنز ہوتا تھا یہ تمام کتابی شکل میں (ہندی رسم الخط) ''نئی گلستاں'' کے نام ہی سے راج کمل پرکاشن سے شائع ہو چکے ہیں۔

کیفی کو ملے ہوئے انعام واعزاز

انعام	کیفیت
۱-اتر پردیش اردو اکادمی کا ادبی انعام	آوارہ سجدے پر
۲-مہاراشٹر اردو اکادمی کا خصوصی انعام	آوارہ سجدے پر
۳-سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ	آوارہ سجدے پر
۴-لوٹس ایوارڈ	آوارہ سجدے پر
۶-نیشنل انٹیگریشن کا پریسیڈنٹ ایوارڈ	(سات ہندوستانی کے گیت پر)
۷-بہترین کہانی پر یسیڈنٹ ایوارڈ	کیفی نے اسے قبول نہیں کیا
۸-بہترین کہانی کا فلم فیئر ایوارڈ	
۹-بہترین فلمی منظرنامے کا فلم فیئر ایوارڈ	
۱۰-بہترین فلمی مکالمے کا فلم فیئر ایوارڈ	
۱۱-ادبی خدمات پر ریاست مہاراشٹر کا گورو ایوارڈ	نقد ایک لاکھ روپیہ
۱۲-پدم شری	(فلمی اور ادبی خدمات پر پدم شری کا انعام ملا، جوانہوں نے غیر جمہوری رویے کے خلاف احتجاجاً واپس کر دیا)
۱۳-ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی اتر پردیش کا انعام	
۱۴-ادبی اور سماجی خدمات پر اتر پردیش سرکار کا انعام	نقد ایک لاکھ روپے
۱۵-کل ہند میر تقی میر اعزاز	اہم تحقیقی کاموں پر
۱۶-دلی سرکار اردو اکادمی کا میلینیم ایوارڈ	گیارہ لاکھ روپے نقد

۱۷-ساہتیہ اکادمی فیلوشپ

۱۸-ایفروایشین رائٹرس ایوارڈ

۱۹-حکومت مہاراشٹر کا گیانیشور ایوارڈ

۲۰-ماہنامہ آپ کی کائنات دہلی کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ

کیفی کی شخصیت

شخصیت کا انحصار ہمیشہ انسان کے داخلی اور خارجی کوائف پر منحصر ہوتا ہے، آل احمد سرور کا یہ مختصر تجزیہ بلاشبہ درست ہے:

''شخصیت صرف موروثی جسمانی خصوصیات کا نام نہیں بلکہ اس اثر کا نتیجہ ہے، جو جسمانی خصوصیات ماحول اور تربیت پر پڑتا ہے۔''(۱)

ابتداء میں شخصیت کی نمایاں شکل نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ حالات اسے اپنی پسندیدہ شکل کے مطابق بنا لیتے ہیں اور تب ہر شخص کی اپنی مرضی کا دخل نہ کے برابر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق:

''ہر شخص بچپن میں ایسے حالات میں پرورش پاتا ہے، جس میں خود اس کی پسند یا انتخاب کو بہت کم دخل ہوتا ہے جب وہ ان اثرات کو اختیار کرتا یا چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے تو اثرات کو قبول یا رد کرنے کا ایسا ذہنی اور جذباتی نظام اس کی شخصیت کا جزو بن چکا ہوتا ہے، جسے مکمل طور پر توڑ پھوڑ ڈالنا قطعی طور پر اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ پھر بھی اپنے محدود اور مختصر سے دائرے میں رہ کر ہر فرد اپنی زندگی بناتا یا بگاڑتا ہے مختلف قسم کے عقیدے نظریے اور تصورات کو قبول یا رد کرتا ہے، نئے معتقدات یا اسالیب فکر ڈھالتا ہے دنیا اور زندگی کی اپنے طور پر ایک نئی توجیہ کر لیتا ہے اس پوری تشکیل کو پیش نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ جسے ہم شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں وہ تین چوتھائی جبر اور ایک چوتھائی

(۱) نظر اور نظریے آل احمد سرور ص۱۲ آل احمد سرور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۳ء۔

اختیار سے تین چوتھائی اجتماعیت اور ایک چوتھائی انفرادیت سے تین چوتھائی خارجیت اور ایک چوتھائی انفرادیت سے مل کر بنتی ہے۔"(۱)

کسی کی صورت کو دیکھ کر اس کے اندرون تک پہونچنا ممکن نہیں ہے اچھی صورت شکل والا خراب شخصیت والا اور بھونڈی اور بھدی شکل والا آدمی بھی اہم شخصیت کا مالک ہوسکتا ہے ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح موتی بطن صدف میں متشکل ہوتا ہے اسی طرح شخصیت کی بھی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔

"انسان کی ظاہری حیثیت ایک صدف کی طرح ہے، جس میں شخصیت ابر نیساں کی بوند کے مثل پروان چڑھتی ہے اور آخر کار جب صدف کو توڑ کر باہر نکلتی ہے تو درثمین کی صورت میں باہر آکر مشاہدہ کرنے والے کی آنکھوں کو دعوت نظارہ دیتی ہے۔"(۲)

مختصر یہ کہ شخصیت تک پہونچنے کیلئے انسان کے ظاہر پر پہلے نظر پڑتی ہے اس کا بطن بعد میں نظر آتا ہے حامداللہ ندوی کیفی کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں:

"قد پورا بدن بھرا ہوا بال لمبے اور گھونگھرالے آواز بھاری اور کھنک دار رنگ گندمی، ناک نقشہ کوئی غیر معمولی نہ تھا، مگر ان کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کے مزاج کا سارا خلوص ساری محبت اور ساری گرمی دل کی گہرائیوں سے نکل کر ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی ہے لب خاموش تھے اور آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔"(۳)

سہیل عظیم آبادی لکھتے ہیں:

"کیفی اعظمی مجھے سیدھے سادے آدمی معلوم ہوئے، دبلے پتلے سانولے رنگ کے آدمی، چہرے پر ہلکی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔"(۴)

---

(۱) جدید اردو ادب ڈاکٹر محمد حسن ص ۲۴۳ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی ۱۹۷۵۔

(۲) احتشام حسین حیات شخصیت اور کارنامے ڈاکٹر فدا المصطفیٰ ص ۷۹ طبع اول ناگپور ۱۹۷۵۔

(۳) کیفی اعظمی چند جھلکیاں حامداللہ ندوی ص ۲۳۰ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔

(۴) کیفی اعظمی سہیل عظیم آبادی ص ۲۳۰ کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی۔ ۱۹۹۲ء۔

فالج کے زبردست حملے کے بعد بایاں ہاتھ اور پیر دونوں بیکار ہو گئے تھے، پھر اسی پیر کی ہڈی ٹوٹ جانے سے بغیر کسی سہارے کے چلنا بھی دو بھر ہو گیا تھا اس زمانے کا ذکر شوکت کیفی کرتی ہیں:

''لکڑی پکڑ کر چلنے سے انتہائی نفرت کرتے ہیں لیکن مجبوری ہے لکڑی پکڑنی ہی پڑتی ہے۔''(۱)

لباس اور وضع

کیفی کو سادے کپڑے مثلاً سفید کھادی کا کرتا اور چوڑی مہری کا پائجامہ پہننا زیادہ پسند تھا کبھی کبھی شیروانی بھی زیب تن کرتے تھے، اس ضمن میں خلیل الرب لکھتے ہیں:

''وہ ڈھیلے ڈھالے لمبے کرتے اور چوڑے پائینچے کے پاجامے میں ملبوس تھا اس کے کپڑے میلے تھے، پاجامے کی مہری زیادہ کثیف تھی اس کے بال لمبے اور الجھے ہوئے تھے، لغوی معنیٰ میں آشفتہ سر اس زمانے میں یہ ہیئت کذائی کامریڈوں کی شناخت ہوا کرتی تھی۔''(۲)

عبدالقوی دسنوی نے کیفی کو نومبر ۱۹۶۷ میں بھوپال میں دیکھا تھا ان کی زبانی کیفی کی وضع قطع ملاحظہ کیجئے:

''ہنستا ہوا پروقار لیکن نرم چہرہ، دمکتا ہوا گندمی رنگ، چمکتی ہوئی وسیع، پیشانی سر پر بڑے بڑے بال، موٹی گردن، کشادہ سینہ، سفید کرتا پاجامہ سلیم شاہی میں نہایت بھاری بھرکم معلوم ہو رہے تھے۔''(۳)

اختر راہی کا بیان ہے:

''وہ شاعر (کیفی اعظمی) دراز قد سفید کرتا پاجامہ سے جامہ زیب تھا، کرتے پر

---

(۱) کیفی اعظمی میرے ہم سفر شوکت کیفی ص ۸۰ کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۔۱۹۹۲ء۔

(۲) کتاب نما ماہنامہ دہلی ستمبر ۱۹۹۵ء ص ۳۷۔

(۳) کیفی اعظمی ایک شاعر ایک مشفق بھائی ۔عبدالقوی دسنوی کتاب نما دہلی ستمبر ۱۹۹۵ء ص ۲۲۵۔

سرمئی اون کا جاکٹ بھی تھا۔“(۱)

کیفی کی وضع قطع کے بارے میں ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

”کیفی صاحب کھدر کا سفید کرتا سپاہیانہ وضع کا پہنے تھے اور یہی وضع ان کے لئے مناسب بھی تھی کیونکہ قدرت نے ان کے چہرے اور تیور میں بھی سپاہیانہ عنصر بھر دیا تھا، بڑی بڑی آنکھیں بھرا ہوا چہرہ اونچی سی ناک چوڑی پیشانی موٹے موٹے ہونٹ سانولا رنگ، بھاری آواز یہ سب خصوصیات ان کی شخصیت کو سپاہیانہ انداز میں پیش کرنے کیلئے کافی تھیں۔اور اس پر ان کی سادگی اور بے تکلفی سونے پہ سہاگہ کا کام دے رہی تھیں۔باتیں کرنے میں وہ مسکراتے کم تھے ہنستے زیادہ تھے۔“(۲)

خوردونوش

غذا کے معاملے میں کیفی سادگی پسند تھے، مرغن غذائیں انہیں پسند نہیں تھیں، جو مل گیا کھالیا، اور اسی پر شکر کیا، ممبئی میں ان کی رہائش کیمون میں تھی تب دال سبزی روٹی چاول پر گزر کرتے تھے، کھانے میں ان کی پسند اور ناپسند کے متعلق خلیل الرب کا بیان ہے:

”میرے چپراسی فقیر محمد کے ہاتھ کے بنائے ہوئے شامی کباب اور خالص گھی سے بگھاری ہوئی ارہر کی دال اس نوجوان کیفی اعظمی کی مرغوب غذا تھی۔“(۳)

لیکن اس کے برعکس کیفی کی مرغوب غذا کے بارے میں شوکت کیفی کا کہنا ہے کہ:

”مرغوب غذا گوشت ہے، اچھا پکا ہوا گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں۔“(۴)

---

(۱) کیفی صاحب جنہیں میں جانتا ہوں-اختر راہی کتاب نما دہلی ستمبر ۱۹۹۵ء ص ۲۰۲۔

(۲) ملک ادب کے شہزادے-ڈاکٹر اعجاز حسین کارواں پبلشر الہ آباد ۱۹۵۴ء۔

(۳) کتاب نما ماہنامہ دہلی-ستمبر ۱۹۹۵ء ص ۳۷۔

(۴) کیفی اعظمی میرے ہم سفر شوکت کیفی ص ۸۰ کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔

اس ضمن میں خلش جعفری نے بہت صحیح لکھا ہے:

''بڑے صبر آزما تھے وہ دن جب پیسہ بہت کم اور بڑی مشکل سے آتا تھا اور اچھا کھانا بھی کبھی کبھار نصیب ہوتا تھا لیکن کیفی نے کبھی ان حالات کی شکایت نہیں کی اور وہ کبھی مایوس اور دل گرفتہ نہیں دکھائی دیئے۔(۱)

اس ضمن میں خلش جعفری آگے لکھتے ہیں:

''کیفی اکثر میرے گھر ٹھہرتے رات کو عموماً کھانے میں کھچڑی ہوتی، جو برہان پور کی عام اور مرغوب غذا ہے وہ بڑے شوق سے کھچڑی کھاتے اور دال چاول کے اس سیدھے سادے مکسچر کو تہاری کہا کرتے تھے۔''(۲)

نوجوانی کے زمانے میں کیفی بیڑی اور سگریٹ کے شوقین تھے چار مینار ان کا محبوب سگریٹ تھا لیکن بعد میں اسے چھوڑ دیا تھا ساگر سرحدی نے کیفی کی مے نوشی کا بھی ذکر کیا ہے:

''ہم اکثر شامیں ان کے ساتھ گزارتے تھے، ایک شام خاص طور سے یاد میں ابھرتی ہے شاید شرد پورنیما تھی ہم سب لکھنے والے ساتھی رات بھر ٹھرا پیتے رہے شعر سنتے رہے سناتے رہے۔''(۳)

عزیز قیسی کے مطابق:

''کیفی صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں مشاعرہ شراب پی کر نہ پڑھوں، مشاعرے کے بعد ان کے ساتھ شراب پیوں میں اس وعدے پر اکثر قائم رہا۔''(۴)

اور حامد اللہ ندوی کا بیان ہے کہ:

''وہ رند ہیں لیکن ایسے رند جس کو مستی میں بھی اپنی وضع کا پاس رہا، جس کے

(۱-۲) کیفی اعظمی کچھ یادیں کچھ باتیں۔خلش جعفری ص۲۴۹ کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔
(۳) کیفی اعظمی ایک خواب اور ساگر سرحدی۔کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۲۱۷۔
(۴) کیفی صاحب دونیم مسکراہٹ کا نام عزیز قیسی ص ۲۱۷۔کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔

قدم مدہوشی میں بھی نہیں لڑکھڑائے ان کی زندگی حسن ومحبت اور سرمستی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔"(۱)

کیفی کا انداز گفتگو اور شعر خوانی

کیفی ہمیشہ نہایت مختصر لیکن جامع گفتگو کرتے تھے لا طائل اور بے معنیٰ گفتگو سے انہیں احتراز تھا، پرمغز اور بامعنیٰ باتیں نرم لہجے میں کرتے تھے، گفتگو میں ہمیشہ مخاطب کی استعداد کوملحوظ خاطر رکھتے، ان کی آواز بھاری بلند اور پروقار تھی لیکن آواز کی کھنک اور لہجے کی لچک ہمکلام کو متاثر کرلیتی تھی کیفی شعر اپنے ایام شباب میں ترنم سے پڑھا کرتے تھے بعد میں تحت اللفظ پڑھنے لگے تھے اس ضمن کا ایک واقعہ علی سردار جعفری یوں سناتے ہیں:

"کیفی صاحب کے زوردار اور مہذب پڑھنے کے انداز نے ان کی شاعری کو ایک خاص معنیٰ عطا کئے اپنی نوجوانی کے زمانے میں وہ بھی دوسرے شاعروں کی طرح مشاعروں میں روایت کی طرح اپنے شعر ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں ایک دفعہ جب انہوں نے اپنی ایک نظم مسز سروجنی نائیڈو کو پڑھ کر سنائی تو آخر میں انہوں نے مسکرا کر پوچھا تمہیں اپنی آواز کا کچھ اندازہ ہے تم نے کبھی سنا ہے؟"

اور پھر انہوں نے کیفی سے اپنی شاعری تحت اللفظ میں پڑھنے کیلئے کہا، جس پر کیفی راضی ہوگئے اور اس کے بعد ہمیشہ کیلئے کیفی اور ان کی شاعری کی سیرت ہی بدل گئی۔"(۲)

کیفی اعظمی کے تحت اللفظ پڑھنے کے بارے میں حامد اللہ ندوی لکھتے ہیں:

"کیفی صاحب ہمیشہ اپنا کلام اپنی اونچی اور بھاری آواز میں ایک مجاہد کی

---

(۱) کیفی صاحب چند جھلکیاں حامد اللہ ندوی ص ۲۱۲ ۔ کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ء۔
(۲) کیفی اعظمی علی سردار جعفری ۔ کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۲۰۱۔

طرح پورے جوش وخروش کے ساتھ سنانے کے عادی تھے اور سناتے وقت اپنے اشعار کے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے اس خوبصورتی کے ساتھ اس کو متصور کر دیتے تھے کہ سامعین پر بھی ایک جوش کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا۔''(۱)

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کیفی کا انداز شعر خوانی بالکل ڈرامائی ہوتا تھا۔ لیکن اس بارے میں عزیز قیسی کا استدلال ہے:

''برا شعر لاکھ ڈرامائی انداز میں پڑھا جائے برا شعر ہی رہتا ہے ہاں اگر اچھا شعر ہو، اور پڑھنے کا انداز بھی اچھا ہو تو پھر شعر کانوں اور آنکھوں کے ذریعے سیدھے دل میں اتر جاتا ہے کیفی صاحب شعر کے ذریعے دلوں تک پہونچنے کا ہنر جانتے ہیں۔''(۲)

عادات مشاغل اور اطوار

کیفی کے مزاج میں سادگی سنجیدگی رواداری، خوش خلقی، خود اعتمادی، شریف النفسی، خورد نوازی اور بزرگوں کا احترام وغیرہ جیسی تمام خوبیاں موجود تھیں، مروت اور رواداری ان کے مزاج میں کمزوری کی حد تک دخیل تھی، بقول خلش جعفری:

''کیفی کے شانت اور گمبھیر چہرے سے ان کی دلی کیفیت کا پتہ لگانا بہت دشوار ہے ان کے کھردرے سے تن کی تہہ میں ایک دردمند نازک اور حساس سا دل ہے، ان کا دل جو اپنے پرایوں کی مصیبتوں اور افتاد پر تڑپ اٹھتا ہے اور یہ ان کے کردار کی خصوصیت ہے کہ وہ دوستوں کے تو دوست ہیں مخالفین اور دشمنوں کے بھی بدخواہ نہیں۔''(۳)

کیفی ہمیشہ سیاسی اور ادبی سرگرمیوں میں تو پیش پیش رہتے تھے لیکن گھریلو ذمہ داریوں یا

---

(۱) کیفی صاحب چند جھلکیاں حامد اللہ ندوی ص ۲۳۴ - کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔
(۲) کیفی صاحب دو نیم مسکراہٹ کا نام عزیز قیسی - کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۲۰۴۔
(۳) کیفی اعظمی کچھ یادیں کچھ باتیں خلش جعفری - کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۲۵۸۔

خرید وفروخت سے بالکل بے تعلق رہتے تھے۔شوکت کیفی لکھتی ہیں:

''کیفی میں ضبط و تحمل اور قوت برداشت بہت زیادہ تھی حد یہ کہ جب ۱۹۷۸ء میں ان کے بائیں پیر کی ہڈی کے تین ٹکڑے ہو گئے تھے فالج کا حملہ ہو ہی چکا تھا تو لوگوں نے پکڑ کر بڑی مشکل سے اٹھا کر کرسی پر بٹھایا تھا شدید تکلیف کے باوجود ہنستے ہوئے شعر سناتے رہے اور جب تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی اور جسم پسینہ پسینہ ہو گیا اور ضبط کا بار نہ رہا تو چپ ہو گئے۔''(۱)

''ساڑھے چار مہینے کیفی کا پیر بندھا رہا نہ کروٹ لے سکتے تھے نہ بیٹھ سکتے تھے ساڑھے چار مہینے تک ایک آدمی چت لیٹا رہا بڑی ہمت کی بات تھی........... میں نے ایک دن بھی ان کو غصہ کرتے یا چڑھتے نہیں دیکھا البتہ جب صبح ہوتی تو سب سے پہلا جملہ کیفی کی زبان سے نکلتا موتی (شوکت) آج ایک دن اور پورا ہوا خدا کا شکر ہے۔''(۲)

کیفی اعظمی ایک ہمدرد انسان تھے جن کے سینے میں وہ دل تھا، جو ہمیشہ دوسروں کے لئے دھڑکتا رہتا تھا۔'' کانٹا چبھے کسی کے تڑپتا ہے میرا دل'' کے مصداق انہوں نے کسی کو بھی پریشان حال یا مشکل میں دیکھنا برداشت نہیں کیا۔فوراً اس کی مدد کرنا ان کا فریضہ فطرت تھا،شاہ خرچ تھے اس لئے پیسہ جمع کرنا ان کی فطرت میں کبھی نہیں رہا،اس ضمن میں اختر راہی کا بیان ہے:

''فلموں سے کمایا ہوا روپیہ ادبی سرگرمیوں اور اپنے دوستوں پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں، میں نے کیفی صاحب جیسا شاہ خرچ کوئی نہیں پایا۔''(۳)

کیفی کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ جب تک جسم میں طاقت رہی اپنے بچوں کے کمائے ہوئے پیسے سے پرہیز کرتے رہے اکثر شبانہ اعظمی کو سمجھاتے ہوئے کہتے تھے:

---

(۱) کیفی اعظمی میرے ہم سفر شوکت کیفی۔کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۷۹۔
(۲) کیفی اعظمی میرے ہم سفر شوکت کیفی۔کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۸۶۔
(۳) کیفی صاحب جنہیں میں جانتا ہوں اختر راہی۔کیفی اعظمی فن اور شخصیت۔شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ص ۳۹۴۔

''نہیں بیٹا انسان کو اس وقت تک اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہئے جب تک اس کی طاقت ساتھ دے۔''(۱)

کیفی کو اگر کبھی ضرورت لاحق ہوتی تو ہمیشہ ان کو فکر رہتی کہ فلموں کے لئے کوئی گانا مل جائے تا کہ اس سے کمائے ہوئے پیسوں سے وہ اپنی ضرورت پوری کر سکیں اور کسی کا بار احسان اٹھانے سے بچ جائیں شعروشاعری کے دوش بدوش انہیں کتابیں خریدنے اور باغ بانی کا شوق تھا۔شوکت کیفی کے مختصر لفظوں میں:

''کتابیں خریدنا ماؤنٹ بلانڈ فاؤنٹین پن تحفے میں قبول کرنا اور پھول پودے لگوانا ان کی دلچسپ ہابی ہے۔''(۲)

کیفی صاحب کم آمیز ہیں لیکن ان کے دوست بے شمار ہیں کیفی صاحب کم گو ہیں لیکن ان کے اطراف ان کو سمجھنے اور ان کو چاہنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔کیفی صاحب تنہائی پسند ہیں لیکن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سے لے کر کمیونسٹ پارٹی اور پھر اپٹا کے ہر ہنگامے اور ہر سرگرمی میں کیفی صاحب سرگرم رہتے ہیں۔کیفی صاحب کم ہنستے ہیں لیکن پتہ نہیں انہیں کیوں دیکھ کر ان سے مل کر ایک خوشی کا احساس ہوتا ہے۔کیفی صاحب کھلتے نہیں لیکن ان کے چاہنے والے برسوں سے ان کے چاہنے والے ہیں۔''(۳)

ساگر سرحدی کا بیان ہے کہ:''وہ دوران گفتگو نہایت دلچسپ چھوٹے چھوٹے لطائف بھی دوستوں یاروں کو سناتے تھے۔''(۴)

خلیل الرب لکھتے ہیں:

''کیفی سنجیدہ مزاج ہیں خشک مزاج نہیں ان کی حس مزاح لطیف ہے۔''(۵)

---

(۱) کیفی اعظمی میرے ہم سفر شوکت کیفی۔کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۷۹۔
(۲) کیفی اعظمی میرے ہم سفر۔کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۸۰۔
(۳) کیفی صاحب دونیم مسکراہٹ کا نام عزیز قیسی۔کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۲۶۵۔
(۴) کیفی اعظمی ایک خواب اور۔ساگر سرحدی: کیفی اعظمی فن اور شخصیت۔شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ص ۲۰۵۔
(۵) کتاب نما ماہنامہ دہلی ستمبر ۱۹۹۵ء ص ۴۴۔

شبانہ اعظمی ظفر حسن سے اپنی بات چیت کے دوران کیفی صاحب کے مزاج کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ بیان کرتی ہیں، ملاحظہ کیجئے:

''ان میں (کیفی صاحب) حس مزاح بہت زیادہ تھا، مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ میں ان کی آنکھوں میں آئی ڈراپ ڈال رہی تھی لیکن آنکھیں چھوٹی ہونے کی وجہ سے دوا نہیں جا رہی تھی۔ میں نے کہا ابا دوائی تو آنکھ میں جا ہی نہیں رہی ہے، تو انہوں نے مجھے ایک قصہ سنایا کہ ''ایک راج کمار تھا وہ کچھ نہیں کرتا تھا ایک دن راجہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ اسے کچھ کام سکھا دو تو وزیر نے اسے تیر چلانے کا سوچا لیکن گھر کی تمام چیزیں اس کے غلط نشانے سے برباد ہو رہی تھیں اور تیر صرف نشانہ پر ہی نہیں لگ رہا تھا وزیر نے بادشاہ کو صلاح دی کہ ہم لوگ نشانے پر جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ راج کمار کا تیر صرف اسی جگہ پر نہیں لگے گا'' اس پر میں ان کی طرف دیکھنے لگی کہ اس بات کا اس وقت کیا مطلب ہے، تو وہ میری طرف دیکھ کر بولے کہ تم میرے کان میں دوا ڈال دو وہ اپنے آپ میری آنکھ میں چلی جائے گی۔''(۱)

''کیفی صاحب اتنے کم گو اور کم آمیز مشہور ہیں کہ ان کی مقبولیت اور ان کے اطراف جمع لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات کیوں مشہور ہو گئی۔''(۲)

اکثر افراد نے لکھا ہے کہ انہیں زور سے ہنستے یا قہقہہ لگاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا لیکن یہ بات نیز اس صداقت پر کھری نہیں اترتی کیفی کے مزاج میں نہ صرف مسرت کامی کے عناصر دخیل تھے، جیسے کہ عموماً ہوا کرتے ہیں بلکہ طنز و مزاح کے جواہر بھی ان میں موجود تھے، اس ضمن میں عزیز قیسی کی یہ تحریر دیکھئے:

''کسی کا بھی مذاق اڑانا ہو تو وہ کبھی کھل کر نہیں اڑاتے کبھی بھی مضحک عمل گفتگو شعر یا شخصیت کے لئے ان کے اپنے اشارے ہیں، جو ان کے مزاج داں سمجھ لیتے ہیں

---

(۱) مضمون مشمولہ راشٹریہ سہارا ۱۹/ مئی ۲۰۰۲ ص ۴ مضمون لیکن سوال یہ ہے کہ دارورسن کے بعد شبانہ اعظمی سے ظفر حسن کی گفتگو پر مبنی مضمون۔
(۲) کیفی صاحب دو نیم مسکراہٹ عزیز قیسی- کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۲۶۵۔

ہاں غیر شخصی باتوں میں وہ کھل کر ہنستے اور ہنساتے ہیں۔"(۱)

عربی قول ہے کہ" **الانسـان ضاحکُ**" یعنی تمام جانداروں میں صرف انسان ہی ہنستا ہے یہ اس کی فطرت کا خاصہ ہے، سرے سے یہ کہہ دینا کہ فلاں شخص ہنستا ہی نہیں درست نہیں لگتا۔ ہر انسان کی اپنی طبیعت ہے کہ وہ اس کے مطابق ہی چلتا اور عمل کرتا ہے۔ میرے خیال میں جن لوگوں نے کیفی کو زیادہ عرصے تک قریب سے دیکھا ان کی صحبت میں رہے ان کو کیفی کی اس وقت کی کیفیت کو ضرور دیکھا ہوگا جب وہ ہنستے ہوں گے، قیسی صاحب کا کہنا زیادہ قرین قیاس ہے کیفی کی ہنسی ان کا مزاج ان کی ظرافت کی شان ہی انفرادی تھی، جو کسی کی مذمت ہتک تمسخر پر مبنی نہیں بلکہ بچوں کی سی ہنسی اور معصومانہ انداز ہوتا تھا۔ اس بارے میں خلش جعفری صاحب تحریر کرتے ہیں:

"میں نے کیفی کو کبھی کسی کی دلآزاری اور تضحیک کر کے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا البتہ خود پر طنز کرنے یا ہنسنے کا حوصلہ وہ خوب رکھتے ہیں۔"(۲)

مختصر یہ کہ کیفی جب سرور میں ہوتے تو ادبی اور نیم ادبی واقعات اور لطائف سناتے تھے، جیسا کہ شبانہ اعظمی کا بیان کردہ واقعہ جو پچھلے صفحہ پر درج ہے، کیفی ان لطائف کے دوران جی کھول کر ہنسا کرتے تھے اور یہ کوئی تعجب خیز امر بھی نہیں۔

کیفی تمام عمر انقلابی رہے پھر بھی انہیں نازک سے نازک مواقع پر کبھی کسی نے لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا، خلش جعفری کے مطابق:

"کیفی دراصل کسی فرد سے جھگڑا کر ہی نہیں سکتے تھے............ میں نے گھر میں بھی انہیں کبھی چیختے چلاتے نہیں سنا............ ہاں جلسوں اور مشاعروں میں کیفی خوب گرجتے تھے اور پورے انقلابی نظر آتے تھے۔"(۳)

---

(۱) کیفی صاحب دو نیم مسکراہٹ۔عزیز قیسی۔کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۲۱۴۔

(۲-۳) کیفی اعظمی کچھ یادیں کچھ باتیں۔خلش جعفری۔کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۲۵۷۔

کیفی کا رکھ رکھاؤ اور رواداری

جیسا کہ پچھلے صفحات میں درج حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیفی اپنے مخالفین کی دلآزاری بھی پسند نہیں کرتے تھے اسی سلسلے میں ایک حیرت انگیز واقعہ ان کی مروت اور رواداری کا شوکت خانم بیان کرتی ہیں ان کے ہی لفظوں میں ملاحظہ کیجئے:

''ایک دن ہمارے گھر میں چوری ہوگئی تمام بیڈ کور چادریں کمبل چوری ہو گئے مجھے معلوم تھا کہ چور کون ہے ایک چور مالی ہمارے گھر کسی کے توسط سے آ گیا تھا جب ہمارے گھر میں مستقل چوریاں ہونے لگیں اور مجھے پتہ چلا کہ یہ سارا کام اسی مالی کا ہے تو میں نے اسے نکال کر باہر کیا اور ایک دن جب ہم لوگ گھر سے باہر گئے اور گھر کھلا ہوا تھا تو موقع دیکھ کر وہ مالی پھر آیا اور گھر کے تمام کمبل چادریں اور بیڈ کور اٹھا لے گیا۔ جب میں نے کیفی سے کہا کہ تم خدا کے لئے پولیس میں اطلاع کرو کہ اس طرح چوری ہوئی ہے اور چور صرف وہی مالی ہے تو کہنے لگے دیکھو شوکت بارش ہونے والی ہے اس غریب کو بھی چادریں اور کمبل کی ضرورت ہوگی، اس کے بچے کہاں سوئیں گے تم تو اور خرید سکتی ہو لیکن وہ نہیں۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا کیا جواب دیتی۔''(۱)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ کیفی کی رواداری سے متعلق رفعت سروش لکھتے ہیں کہ:

''ایک مرتبہ کیفی اور ساحر میں کسی ذاتی اور رومانی قسم کی بات پر اختلاف ہو گیا، جس پر ساحر نے انجمن کے جلسے میں ایک مضمون پڑھا جس میں ان کی شاعری کے نقائص ہی تلاش کرتے ہوئے یہ کوشش کی گئی تھی کہ اول تو کیفی شاعر ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو گھٹیا درجے کا، کیفی جلسے کے آخر تک موجود رہے مگر انہوں نے ایک لفظ بھی اپنی صفائی میں نہیں کہا، سادگی اور سنجیدگی سے پورا مضمون سنتے رہے۔''(۲)

---

(۱) کیفی اعظمی میرے ہم سفر-شوکت کیفی-کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۴۷۔
(۲) ممبئی کی بزم آرائیاں رفعت سروش ص ۱۹۳ ادارہ فکر جدید دہلی ۱۹۸۶۔

کیفی صرف اچھے ترقی پسند شاعر نہیں اچھے انسان اور اچھے کمیونسٹ بھی ہیں کیونکہ اچھا اور بڑا کمیونسٹ وہی ہے، جو کہ اپنے اوپر ہونے والی تنقیدوں کو خنداں پیشانی سے برداشت کرے..........وہ اپنے نقادوں سے خفا ہونے کے بجائے انہیں گلے لگاتے تھے، تنقیدوں پر برانگیختہ ہونے کے بجائے بڑی آہستہ روی سے غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔''(۱)

اسی طرح ان کی رواداری کا یہ حال دیکھئے کہ جیسا کہ پچھلے صفحات میں مرقوم ہے کہ کیفی نے ان تھک دوڑ دھوپ کے بعد جب پھول پور تحصیل سے مجواں تک سڑک بنوانا شروع کی تو گاؤں والے معترض ہوئے اور طرح طرح کے جتن سے اس سڑک کی تعمیر روکتے رہے، آخر تعمیر روک دی گئی کیفی نے دروازے دروازے ہر شخص کو سڑک کے فوائد سمجھائے گاؤں والوں کی اس حرکت پر شوکت دل برداشتہ اور ناراض تھیں اب کیفی کا جذبۂ رواداری عود کر آیا وہ شوکت کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگے:

''بے چارے کسان ہیں وہ تو زمین کے سہارے پر زندہ رہتے ہیں ان کی اتنی زمین چل جائے گی تو وہ کھیتی کس طرح کریں گے۔''(۲)

مروت اور رواداری کی طرح کیفی کا دل قوم کے درد سے بھی پوری طرح مملو تھا۔ انہیں غریب کسانوں اور مزدوروں سے بہت لگاؤ تھا سچ یہ ہے کہ غریبی اور دکھ ان کی آپ بیتی تھا۔ ممبئی میں انہوں نے ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنے کی کوشش کی اپنی حد درجہ شریف النفسی نیک نیتی اور خلوص اور محبت کی وجہ سے دوسروں سے زک اٹھانے کے باوجود انہیں فائدہ پہونچانا چاہا یہی ان کی نمایاں خصوصیات اور اوصاف کہے جا سکتے ہیں، بقول عبد الجبار:

''کیفی کوئی فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہیں اس لئے کمزوریوں اور خامیوں سے مبرا نہیں ہیں لیکن ان میں اچھائیاں اور خوبیاں اتنی زیادہ ہیں کہ کمزوریوں اور خامیوں کو نظر انداز کر دینے کا جی چاہتا ہے۔''(۳)

---

(۱) کیفی میرے دوست میرے رہنما عبد الجبار۔ کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۴۳۴۔
(۲) کیفی اعظمی میرے ہم سفر شوکت کیفی۔ کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ص ۷۶۔
(۳) کیفی میرے دوست میرے رہنما عبد الجبار۔ کیفی اعظمی شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲

اس میں شک نہیں کہ انسان کی فطرت میں خیر وشر دونوں طرح کے جذبات ہوتے ہیں ان دونوں کے درمیان سے جو کردار یا حیات کا پہلو ابھرتا ہے وہ اسے معنیٰ خیز بناتا، خوش اخلاق ٹھہراتا یا بداخلاق کہتا ہے۔کیفی کے کردار، رکھ رکھاؤ اور سماجی زندگی میں ایسا کوئی پہلو نظر نہیں آتا، جسے مدنظر رکھ کر انہیں بداخلاق کہا جاسکے یہ کسی کے کردار کی عظمتوں کی دلیل ہے یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ انسان کی غیر معمولی خوبیاں اس کی شخصیت کے بعض کمزور پہلوؤں کی پردہ پوشی کرتی ہیں اسی نظریے سے اگر تجزیہ کیا جائے تو کیفی کی شخصیت غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔

بیماری اور موت

گذشتہ کئی برسوں سے اپنے گاؤں میں رہ کر کیفی ہر ہر جتن سے گاؤں والوں کی خدمت کرتے رہے، لیکن اب وہ وقت آ گیا تھا جب بقول رواں اناوی:

رہرو سے منزل ہے کہے قریب
کشتی آپہونچی ہے ساحل کے قریب

کیفی کا سفینہ حیات بھی دنیا بھر کے تھپیڑوں سے لوہا لیتے ہوئے لنگر انداز ہونے کے قریب تھا، عمر زیادہ ہوچکی تھی اس لئے کمزوری بھی بہت بڑھ گئی تھی اکثر بیمار رہا کرتے تھے، ان کی بیٹی شبانہ اور ان کے بیٹے بابا اعظمی ان کو ممبئی لے آئے اور کئی مہینے علاج معالجہ میں صرف کئے، کیفی کی دلی آرزو تھی کہ شفایاب ہوکر زندگی کی بقیہ مدت وہ گاؤں میں رہ کر ہی گزاریں لیکن ''من در چہ خیالم وفلک در چہ خیال'' مارچ اپریل ۲۰۰۲ء میں ان کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی ممبئی کے جس لوک اسپتال میں انہیں داخل کیا گیا، پھیپھڑے پوری طرح خراب ہوچکے تھے اس لئے سانس کی آمد شد میں بہت تکلیف ہوتی تھی۔کھانا پینا بھی ختم ہو چکا تھا انہیں آئی سی یو. I.C.U. میں رکھا گیا، غرضکہ ۱۰ رمئی ۲۰۰۲ بروز جمعہ ان کو دل کا دورہ پڑا، اور صبح چھ بج کر چالیس منٹ پر وہ وقت بھی آ گیا، جب ان کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔اس وقت ان کی عمر

۸۴ برس کی تھی۔ انتقال کی خبر سن کر صدر ہندوستان کے. آر نارائن، وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی اور ملک کے دوسرے مختلف سیاسی سماجی رہنماؤں اور اہم ادبی شخصیات نے اظہار غم کرتے ہوئے تعزیتی پیغامات بھیجے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خصوصی پروگرام نشر کئے گئے، اس طرح ترقی پسند شاعری کا ایک اہم رکن ہی نہیں بلکہ ایک عہد کیفی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ان کی موت سے جو زبردست خلا ادب اور فلم کی دنیا میں پیدا ہوا ہے اس کو پر کرنا بڑا مشکل مرحلہ ہے۔

بہت سے نثری اور منظوم تعزیت نامے خراج عقیدت کے طور پر شائع کئے گئے پروفیسر ظفر احمد نظامی نے یوں اظہار غم کیا:

> ''وہ خوابوں کے صورت گر تھے، اہل دل صاحب نظر تھے، سپنوں کو حقیقت میں ڈھالتے تھے، دوسروں کے دکھ پالتے تھے، انہوں نے تنگ دستی سے رشتہ جوڑا قید و بند سے منہ موڑا، پھولوں پودوں کے درمیاں رہے، چوراسی سال کے نوجوان رہے، تین دہائیوں تک موت سے لڑتے رہے، زندگی کیلئے جھگڑتے رہے، ان کے جانے سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا فنکار ابدی نیند سو گیا، وہ مجاہدانہ شان سے جیئے جب تک رہے آن بان سے رہے، وہ نہیں تو ان کا نام زندہ ہے اس شعر میں ان کا پیغام زندہ ہے:
>
> خار و خس تو اٹھیں راستہ تو چلے
> میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے(۱)

ڈاکٹر رضوان احمد کے تاثرات ملاحظہ کیجئے:

> ''آج جب ملک میں فرقہ واریت ہی کی نہیں فسطائیت کی آندھیاں چل رہی ہیں ایسے شخص اور عوامی شاعر کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ایک بڑا سانحہ ہے مگر دنیا میں جہاں بھی لوگوں پر ظلم و جبر ہوگا استحصال کیا جائے گا وہاں کیفی کی شاعری ان کی ترجمان بن کر ابھرے گی، اور ان کی شاعری زندہ رہے گی۔''(۲)

---

(۱) ماہنامہ ایوان اردو دہلی ۱۰ / اگست ۲۰۰۲ ص ۶۰ کیفی اعظمی ایک خاکہ محررہ پروفیسر ظفر احمد نظامی۔

(۲) ماہنامہ ایوان اردو دہلی اگست ۲۰۰۲ ص ۸۲۔

علی جواد زیدی نے اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا کہ:

''کیفی اعظمی کی موت سے ایسا لگتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کا تختہ ہی الٹ گیا ہے اور دنیائے ادب میں ایک ہُو کا عالم محسوس ہو رہا ہے۔ ان کی رحلت ترقی پسند شاعری کیلئے ایک بڑا سانحہ ہے۔''(۱)

گوپی چند نارنگ نے کہا کہ:

''کیفی اعظمی ان ممتاز ترقی پسند شعراء میں تھے، جنہوں نے ممبئی کو اپنا گھر بنایا اور فلموں کے ذریعے بھی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے اپنی زندگی ہندوستانی محنت کشوں اور غریبوں کے واسطے جدوجہد کیلئے وقف کر دی تھی۔''(۲)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد:

''کیفی اعظمی کا انتقال اردو زبان وادب کیلئے اور ہمارے سماجی اور سیاسی ماحول کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے۔ وہ اپنی صحت کی خرابی کے باوجود اردو زبان وادب کی جس طرح خدمت کرتے رہے اس کی مثال ورکہیں نہیں ملتی۔ کیفی اعظمی صرف ایک اہم شاعری ہی نہیں تھے بلکہ ادب کی ترقی پسند تحریک کے اہم ستون بھی تھے۔''(۳)

ڈاکٹر نیر مسعود:

''کیفی صاحب ترقی پسند شاعری کے آخری نمائندے تھے، وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انہوں نے گلستان سعدی کی طرز پر نئی گلستاں کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، وہ مرثیہ نگار بھی تھے۔''(۴)

ڈاکٹر آصفہ زمانی:

''ترقی پسند شعراء کی آخری کڑی تھی ہم سے جدا ہوگئی۔ کیفی اعظمی ایک عظیم شاعر ہونے کے علاوہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ وہ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے

تھے۔ وہ آخر وقت تک فالج کے حملے کے باوجود جس خود اعتمادی کا ثبوت دیتے رہے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انہوں نے زندگی کے کسی موڑ پر ہار نہیں مانی۔ انہوں نے زندگی کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔"(۱)

کچھ شعراء نے خراج عقیدت کے طور پر قطعات تاریخ ارسال کئے تھے سب سے پہلے ظفر مراد آبادی کے قطعات ملاحظہ کیجئے:

احتجاج ظلم انسانی لئے
شکوہ بخ آگہی تھا اک دماغ
بجھ گیا دوست اجل سے آخرش
اشتراکی فکر کا روشن چراغ

......☆☆☆......

سوگ میں ہیں اہل دل اہل نظر
درد میں ڈوبی ہے سب کی گفتگو
وہ نہیں ہے اب سخن کی بزم میں
جس سے تھی اردو ادب کی آبرو

......☆☆☆......

ظلم سے لڑتا رہا جس کا قلم
بن گئی بن باس جس کی زندگی
چھ دسمبر کے تعلق سے ملا
ایک دل آزردہ کیفی اعظمی

---

(۱) نیادور خصوصی نمبر کیفی اعظمی جولائی - اگست ۲۰۰۲ء

نظم ہو نغمہ ہو یا کوئی غزل
دل کی دھڑکن بن کے رہتے ہیں مدام
موت آجاتی ہے شاعر کو مگر
زندہ رہتا ہے سدا اس کا کلام

(ظفر مرادآبادی)(۱)

رباعیات تاریخ ارتحال از اشراق حمزہ پوری حمزہ پور شیر گھاٹی گیا (بہار)

''ہائے تاریخ ارتحال کیفی ہے''

اک طرز سخن طرز ہنر ملتا ہے
آکاش کے تاروں سا گہر ملتا ہے
شعروں میں آپ کے جناب کیفی
باندھا ہوا جبریل کا پر ملتا ہے

......☆☆☆......

اردو کی معتبر نشانی کہیے
اس کے شعروں کو گلفشانی کہیے
اک ہستی مثال تھی وہ اشراق
آپ اس ہستی کو جاودانی کہیے

......☆☆☆......

ہونا ہے ہمیں بھی اور تمہیں بھی رخصت
پھر ہوتے نہ کیوں سرور و راہی رخصت

---

(۱) ماہنامہ ایوان اردو دہلی اگست ۲۰۰۲ ص ۱۴ ظفر مرادآبادی۔

ہاتف نے کہا سنتے ہیں بیشک بیشک
لو آج ہوئے شاعر کیفی رخصت

۲۰۰۲ء

(اشراق حمزہ پوری)(۱)

عمران عظیم کے تاثرات ملاحظہ کیجئے:

(نذر کیفی اعظمی)

اب کہاں وہ جرات اظہار کیفی اعظمی
ہوگیا ناسور سخن دوبار کیفی اعظمی
رہ گیا ثانی کہاں اس کا جہان شعر میں
وقت سے تھا برسرپیکار کیفی اعظمی
خاک میں شعروسخن کے بام ودر غلطاں ہوئے
کون ہے اب غازی گفتار کیفی اعظمی
علم وحکمت کا خسارہ کس طرح برداشت ہو
شاعری ہے ست ہے بازار کیفی اعظمی
شعر رستے کے مسافر اس لئے غمگین ہیں
کٹ گئے سب پیڑ سایہ دار کیفی اعظمی
کون سنتا ہے صدا ٹوٹے ہوئے دل کی عظیم
کس سے جا کر میں کروں اظہار کیفی اعظمی (۲)

---

(۱) ایوان اردو ماہنامہ اگست ۲۰۰۲ص ۴۹۔
(۲) نیادور خصوصی نمبر کیفی اعظمی جولائی-اگست ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر ارشد الاعظمی یوں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں:

آہ! کیفی اعظمی

آسماں ششدر زمیں حیران ہے
کس کی رحلت سے چمن ویران ہے
کس کے غم میں ہے صف ماتم بچھی
کس کی رخصت سے فضا سنسان ہے

......☆☆☆......

کس نے توڑا رشتہ مہرووفا
ہوگیا کس بات پہ ہم سے خفا
زندگی کو بخشی تھی جس نے جلا
موت کا پیغام پاکر چل دیا

......☆☆☆......

محسن اردو زباں خاموش ہے
اک ادب کا پاسباں خاموش ہے
جس کا اردو پہ ہے احساں گراں
آہ وہ خلد آشیاں خاموش ہے

......☆☆☆......

آہ کیفی اعظمی کی یہ وفات
جس سے ہے مغموم روح کائنات
اشک خوں آنکھوں سے ہیں ارشد رواں
نوحہ خوانی پہ ہوئی مائل حیات

(ڈاکٹر ارشد الاعظمی)(۱)

تنویر ماہلی نے اپنا منظوم خراج عقیدت ''وہ آج بھی ہے'' کے عنوان سے پیش کیا:

وہ امن اور آشتی کا رہبر
وہ ظلمتوں کی دبیز چادر پر
جلوہ افروز
روشنی کا ہمسر
وہ اپنے سینے میں
دل کی کشتی کا ناخدا تھا
ہزار طوفان میں بھی رہ کر
وہ جس کے افکار کی مہک سے
فضائے نظم و غزل معطر
وہ اک فرشتہ تھا اس زمیں پر
وہ اک سخن ور
وہ آج بھی ہے
ہمارے اور آپ کے درمیاں
بہت ہی تاباں
بہت منور

تنویر ماہلی، ماہل اعظم گڑھ (۲)

---

(۱) روزنامہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ ۱۹/مئی ۲۰۰۲ ص ۳۔
(۲) نیا دور خصوصی نمبر کیفی اعظمی جولائی۔اگست ۲۰۰۲ء

جاوید یوسف الہ آبادی نے منظوم خراج ''لہجے میں وہ جلال............'' کے عنوان سے پیش کیا:

کیف وسرور

رنگِ وفا

اور انقلاب

تیرا کلام

کتنے ہی رنگوں کا امتزاج

لہجے میں وہ جلال

کہ بیدار ہوگیا

محنت کشوں کا سویا ہوا

سوختہ سماج

موجِ صبا سے ہوتی رہی

گفتگو تیری

آب رواں سے تو نے کیا

بے ساختہ کلام

تیرا مزاج

آئینہ امکان بن گیا

اک عکس بے مثال

مہکتا ہوا گلاب

محسوس ہوگی تیری کمی

محفلوں میں اب

آئے گی سب کو یاد

تیری صدائے جوش

جاوید یوسف الہ آبادی، کالحجو روڈ، الہ آباد(ا)

رئیس الشاکری نے ''دم ساز قلم کیفی اعظمی'' کے عنوان سے اپنا منظوم خراج عقیدت اس طرح پیش کیا ہے:

جو نام آجائے کیفی اعظمی کا
منارہ دیکھے اردو شاعری کا

سکونِ روح کا پیغامبر تھا
علمبردار امن و آشتی کا!

عطا کیں راحتیں دردِ جگر کو
غموں کو رنگ بخشا سرخوشی کو

نقوشِ پا چراغِ آدمیت کا
کوئی دیکھے سفر اس آدمی کا

سلامی کو بڑھے فکرونظر بھی
وہ دانش ور تھا شہر آگہی کا

صدا نے چھوڑدی لفظوں کی بستی
علاقہ دور تک ہے خامشی کا!

کسی زنجیر کی ''جھنکار'' جاگی
کھلا جس روز غم دیوانگی کا

فروزاں کر گئے ''آوارہ سجدے''
طریفہ ''آخر شب'' زندگی کا

(ا) نیا دور خصوصی نمبر کیفی اعظمی جولائی-اگست ۲۰۰۲ء

غزل ہو نظم ہو یا گیت اس کے
جھلکتا ہے سلیقہ شاعری کا!
تھکے ہارے تھے شاید سو گئے ہیں
یہ رخ اچھا ہے کیفی اعظمی کا!

رئیس الشاکر یردولی شریف-فیض آباد(۱)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے یہ کلمات صد فیصد درست ہیں:

''کیفی اعظمی اپنی انسان دوستی وطن پرستی، سیکولرازم اور بہترین ہندوستانی سماج کی آرزومندی کے لئے یاد رکھے جائیں گے۔ افسوس وہ سانچہ ہی ٹوٹ چکا ہے، جس میں ایسی شخصیتیں ڈھلا کرتی تھیں۔''

ع-''جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے ہی جاتے ہیں''(۲)

---

(۱) نیا دور خصوصی نمبر کیفی اعظمی جولائی-اگست ۲۰۰۲ء

(۲) ماہنامہ ایوان اردو دہلی-ص ۱۷-اگست ۲۰۰۲ء۔

باب دوم

تاریخی، سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر

ہندوستان میں سیاسی، سماجی اور قومی بیداری کی شروعات انیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہو چلی تھی۔ اس سلسلے میں سماجی تحریکات جیسے برہمو سماج اور مسلمانوں میں ولی اللہ تحریک، وہابی تحریک وغیرہ عوامی پیمانے پر ذہنی بیداری کے پیغامات دے کر اس سمت عوامی ذہن کو پیش رفت پر اکسا رہی تھیں اور اس کا خاطر خواہ اثر بھی ہو رہا تھا۔ ان مذہبی تحریکات نے مسلسل کوششوں کے بعد عوام کی ذہنی اور فکری سطح کو ایسا متاثر کیا تھا کہ وہ اب آزادی کا مفہوم سمجھنے لگے اور اس کی اہمیت کا اندازہ بھی انہیں ہو چلا تھا۔ ابتداء میں ہندوستان میں یہ جذبہ انگریزوں کی عیاریوں کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر بیدار ہوا تھا کیونکہ ملک بھر میں عیسائی مشینریاں، عیسائی مذہب کی ترویج و اشاعت میں مستعدی سے سرگرم عمل تھیں، ہندوستان کے کونے کونے میں ان کے تبلیغی مراکز قائم تھے، یہ تبلیغی سرگرمیاں ترغیب و تحریص کے وسیلے سے عوام الناس کو اپنا ہم خیال بنانے کو اپنا منشائے خاص بنائے ہوئے تھیں اور انہیں اپنے مذہب کا پیرو بنانے پر تلی ہوئی تھیں، عیش و مسرت کی آسانیاں، سماج میں باعزت مقام اور بڑے بڑے عہدوں کا لالچ دے دے کر انہیں اپنے مقاصد میں بڑی حد تک کامیابی مل رہی تھی، اس سلسلے میں پروفیسر احتشام حسین صاحب روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فوجوں میں عہدوں کی ترقی کا انحصار بہت کچھ تبدیلی مذہب پر رہ گیا تھا او ر یہ تحریص ایسی نہ تھی کہ جس کا شکار بہت سے لوگ نہ ہو جاتے ہوں مشن کے پادریوں کو عام اجازت تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً فوجی چھاؤنیوں میں جا کر دین مسیحی کی خوبیاں بیان کریں اور تبدیلی مذہب پر دینی اور دنیوی فلاح کی بشارت دیں۔''(۱)

---

(۱) جدید ادب منظر اور پس منظر ص ۱۲۳ سید احتشام حسین اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۶ء۔

غرضکہ عیسائی مذہب کی تبلیغ انگریز حکومت کی زیر سرپرستی تمام سرکاری ذرائع ابلاغ سے زور وشور سے ہورہی تھی۔لوگ دین سے زیادہ دنیاوی آسودگی اور بہبود کیلئے اسے اختیار کرتے چلے جارہے تھے۔ اس صورت حال سے باشعور طبقہ بہت زیادہ فکرمند ہوا اس نے اس کو ایک سنگین خطرہ ٹھہراتے ہوئے لوگوں کو اس سے دور رکھنے کی ان تھک کوششیں کیں۔اپنی دیرینہ تہذیب کی عظمت اقدار کی بلندی وسرفرازی کا احساس دلاتے ہوئے اپنے مذہب کی اہمیت کا بھی احساس دلانے کا ایک باقاعدہ منصوبہ بنایا۔اس کیلئے یہ ضروری تھا کہ مذہب میں دخیل پرانی فرسودہ قسم کی رسوم اور رواج سے لوگوں کو آگاہ کر کے مذہب کی اصل روح سے آشنا کیا جائے اسی لئے اس دور میں یہ مذہبی تحریکیں باقاعدہ طور پر وجود میں آئیں، جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے طور پر اصلاح معاشرہ کا کام شروع کیا۔ہندوؤں میں اصلاحی نقطہ نظر سے جو تنظیمیں وجود میں آئیں ان میں برہموسماج، آریہ سماج، پرارتھنا سماج، رام کرشن مشن وغیرہ اور مسلمانوں میں وہابی تحریک، سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک، شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، فرائضی تحریک نہایت کارآمد ثابت ہوئی تھیں۔خلیل الرحمٰن اعظمی کے خیال کے مطابق:

''انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے اپنی حکمت عملی سے کچھ ایسے کام کئے، جس سے ہندوستانیوں کو کچھ فیض ضرور حاصل ہوا، جیسے تعلیم کا رواج، ستی پرتھا کا خاتمہ، دختر کشی کی رسم کا سد باب، اخباروں کو آزادی رائے دینا اور ملک میں صنعت وحرفت کی ترویج وغیرہ ان باتوں سے ہندوستانیوں کے بدلتے ہوئے ذہن نے قومیت کے جدید تصور کی تشکیل کی اور بیرونی اقتدار کے تسلط اور معاشی اور تہذیبی استحصال کا احساس عام ہونے لگا تھا اس احساس کی شدت سے ۱۸۵۷ء کا انقلاب وجود میں آیا، جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیکر متہم کیا۔''

بقول احتشام حسین:

''غدر کوئی ارتقائی انقلاب نہ تھا، پوری اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں

ہندوستان کے دل میں جو پھوڑا پک رہا تھا وہ پھوٹ گیا۔ چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی اور اگر چہ وہ آگ بجھادی گئی لیکن اس نے جو گرمی پہنچادی تھی اور تھوڑی دیر کے لئے جو روشنی دکھائی دی تھی ان میں بہت سے تصورات اور خیالات کی عمارتیں کھڑی ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ انحطاطی دور ہمیں اس احساس وشعور کے سوا کچھ بھی نہ دے سکتا تھا۔ غدر میں جو لوگ چونکے انہوں نے بڑے واقعے کو نئی زندگی کا نقطۂ آغاز بنالیا اور اس کے بعد ہمارے سامنے بہت سی نئی تحریکیں آ گئیں چونکہ ظاہری اور مادی طور پر ہندوستان کو شکست ہوئی تھی اس لئے اسلحے چھن گئے تھے، غیر ملکی حکومت کی گرفت مضبوط ہوگئی تھی اس لئے ایک طرح کی مایوس کن شکست خوردذہنیت پیدا ہوگئی اور نتیجے کے طور پر اس سے نکلنے کیلئے اصلاح پسندی کا دور شروع ہوا۔''(۱)

انقلاب ۱۸۵۷ء جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک افسوسناک اور بہت ہی اہم موڑ ہے، جس نے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی میں ایک زبردست انقلاب کی شروعات کردی تھی اور ہندوستان عہد وسطیٰ کی غفلتوں سے اچانک چونک کر بیدار ہوا اور اسی کے ساتھ ایک نئی حیات اور نئے دور کا آغاز ہوا۔ پروفیسر سید احتشام حسن اپنے مقالے ''اردو ادب انقلاب ۱۸۵۷ء'' کے پس منظر میں تحریر کرتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کا انقلاب ایک خاموش کسی حد تک غیر منظم اور مبہم قومی احساس کا وہ نقطۂ آخر تھا، جس کے بعد سے ہندوستانی ذہن نے ایک نیا سفر شروع کیا اور گو اس میں قدیم افکار وخیال اور چھوڑی ہوئی منزلوں کی گرد بھی شامل رہی لیکن آگے کی منزلوں میں قدم اٹھاتے وقت ایک نئے شعور کی روضرور کام آئی اس لئے غدر کے بجائے انقلاب کہنا ہے زیادہ موزوں ہوگا۔''(۲)

---

(۱) جدید ادب منظر اور پس منظر ص ۱۲۳ سید احتشام حسین اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۶ء۔

(۲) عکس اور آئینے احتشام حسین ص ۱۰۹-۱۹۷۷ء۔

غدر یا انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد مغلوں کی حکمرانی بالکل ختم ہوگئی تھی اور انگریز پورے ملک پر قابض ہو گئے تھے غدر سے پہلے ہندوستانی زندگی نے مغربی اثرات بہت کچھ دھیرے دھیرے قبول کر لئے تھے۔ لیکن بعد غدر ان کی معاشرت اور تہذیب کا اثر اب براہ راست پڑنے لگا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں نئے طرز کی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ تار، ڈاک، ریل موٹر اور مغربی ممالک کی سائنسی ایجادوں سے ہندوستان کے لوگ جیسا کہ کہا جا چکا ہے واقف ہو چکے تھے، جس سے دوریاں کم ہوئیں صنعتی کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ اسی وجہ سے گھریلو دستکاریاں زوال پذیر ہونا شروع ہوئیں، انگریزی تعلیم کے رواج سے ہندوستانیوں کی فکر و نظر کے دروازے کھلنے لگے اور وہ دھیرے دھیرے دنیا بھر کے حالات سے آشنا ہونے لگے، جمہوریت انسانی مساوات اور آزادی کے جذبات ان کے دلوں میں پیدا ہونے لگے بقول حامدی کشمیری:

> ''ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں نے مشہور یوروپی ادیبوں اور مفکروں جیسے والیٹر، کارلائیل، برک مل روسو کے انقلاب انگیز اور حریت پرور خیالات کا مطالعہ کیا ان کے ذہنی افق کھل گئے اور وہ شدت سے محسوس کرنے لگے کہ غیر قوم کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنا غیرت قومی کے منافی ہے۔''(۱)

ہندوؤں میں اصلاحی تحریکات جاری تھیں، اور وہ لوگ ذہنی طور پر ترقی کی راہوں پر گامزن تھے، اعلیٰ تعلم حاصل کر کے انگریزوں کی نگاہ میں مسلمانوں سے بہتر تھے، اس لئے کلیدی عہدوں پر فائز تھے، لیکن مسلمان انگریزی تعلیم کا حصول گناہ تصور کرتے تھے اور مسلمان غلط تعلیم و تربیت گمراہ کن تہذیبی تصورات اور ناقص فکر و نظر اور کم علمی کی وجہ سے نئے زمانے اور نئی فضاؤں سے منہ موڑے ہوئے تھے، بیشتر حالات میں اس کا سبب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ انگریزوں کا سلوک اور ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ عام طور پر حکومت برطانیہ سے ان کی شدید نفرت کا سبب تھا اور اس نفرت

---

(۱) جدید اردو نظم اور یوروپی اثرات حامدی کشمیری ص ۸۵ مجلس اشاعت ادب دہلی ۱۹۶۸ء۔

نے انہیں ہر نئی چیز سے جس کا تعلق مغرب سے ہو ان کے دلوں میں بیزاری پیدا کردی تھی اور قومی قدامت پرستی کے دھارے میں لکیر کے فقیر بنے ہوئے تھے اور سماجی سیاسی اور عملی زندگی کی نئی تبدیلیوں اور رجحانات سے چشم پوشی اختیار کئے ہوئے مطمئن بالکل شتر مرغ جیسی خصلت کہ بالو میں سر چھپا کر سمجھتا ہے دشمن سے محفوظ ہو گیا حالانکہ محفوظ نہیں رہ پاتا۔ ان حالات کا مشاہدہ کر کے سر سید احمد خاں سامنے آئے اور انہوں نے علی گڑھ تحریک شروع کی اور مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی جانب راغب کرنا شروع کیا، جس کی قدامت پرستوں کی طرف سے سخت مخالفت کی گئی حتیٰ کہ ان پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ اس ہنگام میں سر سید جیسا باشعور انسان جسے بدلتے ہوئے حالات کا گہرا علم تھا انہوں نے محسوس کیا کہ ہماری پسماندگی اور زبوں حالی کا سبب مسلمانوں کی جدید تعلیم سے بیزاری ہے چنانچہ انہوں نے ہر ابتلا آزمائش اور سخت حالات سے نبرد آزمارہ کر مسلمانوں میں حوصلہ پیدا کیا اور انہیں احساس کمتری سے نجات دلائی۔ غرضکہ انگریزوں اور مسلمانوں کے مابین ایک گہرے پانی میں انہوں نے ایک پل کی طرح کام کر کے انہیں جوڑنے کی سعی جمیل کی عوام کی غلط فہمی اور ہٹ دھرمی کے چنگل سے گلوخلاصی کرائی۔ سائنٹفک نظریے کو عام کرنے کے لئے ۱۸۶۳ء میں انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی بنائی اور مسلمانوں میں جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے ۱۸۷۵ء علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بناڈالی، بقول یعقوب یاور:

> ''سر سید احمد خاں کا اصلاحی مشن بالخصوص مسلمانوں کی پسماندگی اور احساس کمتری دور کرنے اور بالعموم تمام ہندوستانی ذہن بیدار کرنے اور انہیں جدید علوم وفنون سے آراستہ کرنے کی غرض سے تھا۔''(۱)

حالانکہ ان تمام تر اصلاحی تحریکات میں مذہب کا عنصر غالب تھا لیکن ان تحریکات کے افکار اور نظریات نے سست رفتار سے ہی سہی ضرور روشنی عطا کی اور وہ رفتہ رفتہ قدیم اور فرسودہ گمراہ کن اور تباہ کردینے والے رسم ورواج جن کی طرف خصوصی طور سے پریم چند کے افسانوں میں اشارہ ملتا ہے، کی

(۱) ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری یعقوب یاور ص ۱۲۴ ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۱۹۹۷ء۔

قید و بند سے آزاد ہو کر ایسی تنظیمیں ادارے اور جماعتیں بنانے لگے، جن کا مطمح نظر سیاسی جدوجہد تھا چنانچہ اس کے نتیجے میں کلکتہ لینڈ ہولڈر سوسائٹی ممبئی ایسوسی ایشن بنگال برٹش انڈیا سوسائٹی اور برٹش انڈیا ایسوسی ایشن جیسی تنظیمیں وجود میں آئیں۔

غرضکہ ملک میں جو ترقی پسند عناصر ارتقائی منازل سر کر رہے تھے ان کا متحد ہونا بھی فطری طور پر لازمی تھا۔ چنانچہ اس سیل تند و تیز کو انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لینا زیادہ مصلحت سے قریب جانا اس مقصد کے حصول کیلئے لارڈ ڈفرن گورنر کی ایما پر لارڈ اے او ہیوم کی مدد سے ممبئی میں ۲۸ ردسمبر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی شروع میں اس نئی تنظیم کا مقصد محض حکومت برطانیہ کے مفادات کی محافظت تھا۔ کانگریس کے بننے سے انگریزوں کو آزادی کی تحریک کو بڑھنے سے روکنے اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے بدامنی اور انتشار پر قابو پانے میں بہت مدد ملی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا آخر کار کانگریس کی کوششیں بار یاب ہوئیں اور یہ تمام جدوجہد تحریک آزادی کا روپ اختیار کر گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے متحد ہو کر لڑی تھی، جس سے انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ اگر ہندوستان میں حکومت کرنا ہے تو ہندو اور مسلمان کے بیچ نفاق پیدا کرنا ضروری ہے یہی Dived and Rule کی بدترین پالیسی سے کام لیکر انہوں نے ہندوستانی عوام کو دو حصوں میں بانٹ کر ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، جس کا ردعمل یہ ہوا کہ ۱۹۰۶ء کے کانگریس اجلاس میں دادا بھائی نوروجی نے پہلی بار سوراج حاصل کرنے کے تصور کو واضح کیا۔ سودیشی تحریک کو انگریزوں نے کچل کر رکھ دیا تھا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی گئی۔ شروع میں اس میں صرف اعلیٰ طبقے کے مسلمان ہی شامل تھے۔ لیکن جلد ہی وہ بھی کانگریس کی طرح انگریزوں سے محاذ آراء ہو کر تحریک آزادی کی ہمنوائی کرنے لگی بالآخر ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے بھی سوراج کا حصول اپنا نصب العین بنالیا۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ دونوں پارٹیوں کا مقصد صرف ہندوستان کو آزادی دلانا ہے جداگانہ اپنے اپنے بینر تلے انتخاب میں حصہ لینا ہے اور ہر ممکن طرح سے ہندوستان کو ڈومنین اسٹیٹ کا درجہ دلانا ہے۔ ۱۹۲۴ء تک دونوں پارٹیوں مسلم

لیگ اور کانگریس میں خوشگوار تعلقات بحال رہے لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر لکھنؤ معاہدہ ۱۹۲۷ میں پھر منسوخ ہوگیا چنانچہ مسلم لیگ نے کانگریس کی سائمن کمیشن کی مخالفت کرنا شروع کی۔ حالانکہ یہ مخالفت بارآور نہ ہوسکی لیکن دونوں پارٹیوں کے درمیان خلیج ضرور حائل ہوگئی۔

۱۹۱۴ء میں رولٹ ایکٹ پاس ہوا اس وقت گاندھی جی سیاست میں اپنے قدم جما چکے تھے۔ اسی زمانے میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی اس جنگ میں برطانیہ نے ہندوستان کو بھی ملالیا ان دنوں کانگریس کی قیادت اعتدال پسندوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لئے انہوں نے جنگ میں برطانیہ کی حمایت کا اعلان کردیا۔ ۱۹۱۶ء میں ہوم رول لیگ کا قیام عمل میں آیا جنگ چھڑ چکی تھی اس لئے جنگ کے ٹیکس بڑھادیئے گئے اور اشیائے ضرورت بہت مہنگی ہوگئیں۔ اس لئے اس زمانے کے ادب پر ان تحریکوں اور ملکی انتشار کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ ادھر گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں ستیہ گرہ کا اعلان کردیا۔ ۱۳راپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ کا سانحہ پیش آیا، جس میں مرد وعورت، بچے بوڑھے ملاکر قریب ایک ہزار جانیں تلف ہوئیں۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک اور خلافت تحریک مل گئیں اور ہندوستان کی تحریک آزادی کا حصہ بن گئیں، جس سے ہندو مسلم اتحاد قائم ہوگیا۔ اسی دور یعنی ۱۹۲۰ میں ٹریڈ یونین کانگریس قائم ہوئی تھی محض چھ ماہ میں قریب دوسو ہڑتالیں ہوئیں، جن میں لاکھوں مزدوروں نے حصہ لیا۔(۱)

۱۹۲۱ء میں کانگریس کے احمد آباد اجلاس میں سب سے پہلے مولانا حسرت موہانی نے مکمل آزادی کی قرارداد پیش کی، جو گاندھی کی مخالفت کا شکار ہوکر مسترد کردی گئی اس اجلاس میں یہ قرارداد پاس ہوئی تھی کہ پرامن طور پر ترک موالات کی تحریک جاری رہے گی جب تک کہ گورنمنٹ مظالم کی تلافی ہوکے سوراج نہ مل جائے۔ اسی زمانے میں گورکھپور میں چوری چورا کا سانحہ رونما ہوا، بھیڑ نے تھانے میں آگ لگادی، جس

---

(۱) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۲۰۳ رایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۶ء۔

سے ۲۲ سپاہی جل کر خاک ہو گئے ۔گاندھی جی نے موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے کی مرضی کے خلاف ستیہ گرہ ختم کر دیا عوام کا جذبہ منتشر اور سرد ہو گیا۔ دیش بندھو اور موتی لال نے کانگریس چھوڑ کر سوراج پارٹی بنائی ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں سوراج پارٹی کو خاطر خواہ کامیابی ملی آخر کار کانگریس نے بھی سوراج پارٹی کی ہمنوائی اختیار کر لی۔

۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۸ء کے مابین ملک سیاسی اعتبار سے منجمد سا رہا۔لیکن فرقہ پرستی کو عروج حاصل ہوا۔ ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ دست وگریباں ہو گئیں سوراج پارٹی بھی اس زد سے نہ بچ سکی گاندھی جی نے ان فسادات کے خلاف مولانا محمد علی جوہر کے مکان پر ۲۱ دن تک برت رکھا لیکن یہ سب بے سود ہو گیا۔''(۱)

عالمی صورت حال یہ تھی کہ ۱۹۱۷ء میں روس میں زبردست انقلاب آ گیا تھا اور وہاں زار حکومت کا تختہ پلٹ کر مزدوروں اور محنت کشوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی اس کے اثرات ساری دنیا میں پھیل گئے تھے، ہندوستانی سیاست بھی ان اثرات سے بچ نہ سکی اور یہاں بھی کمیونسٹ پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی۔کانگریسی رہنما جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس بھی اشتراکیت سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا، جس کے سبھی ممبر انگریز تھے۔اس سے ہندوستانیوں کو الگ تھلگ رکھا گیا۔ چنانچہ ملک بھر میں اس کے خلاف مظاہرے ہوئے، جس کے نتیجہ میں کلکتہ اور مدراس میں مظاہرین پر گولیاں برسائی گئیں لاہور میں لالہ لاجپت کو لاٹھیوں سے پیٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔موتی لال نے ملک کی سیاسی پارٹیوں کے اجلاس میں ایک نئی کمیٹی کی تشکیل کی کمیٹی کی رپورٹ جس کو نہرو رپورٹ کا نام دیا گیا اس نے ہندوستان میں ڈومینن اسٹیٹ کا مطالبہ کیا۔اس کی بعض باتوں سے مسلم لیگ کو انحراف تھا اس زمانے میں محمد علی جناح نے ۱۴ نکاتی رپورٹ پیش کی، لیکن یہ منظور نہ ہو سکی اور آخر کار ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لئے الگ ملک بنانے کا مطالبہ کیا اس طرح قومی تحریک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ۱۹۳۰ء میں

(۱) جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ ڈاکٹر عقیل احمد ص ۱۸ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۹۳ء۔

دوسری سول نافرمانی تحریک شروع ہوئی گاندھی جی نے ڈانڈی یاترا کی اور نمک قانون توڑا یہ تحریک پورے ملک میں ہمہ گیر ہوگئی۔ لاکھوں لوگوں نے ستیہ گرہ کی اور غیر ملکی سامان کا بائیکاٹ کیا۔ کسانوں نے لگان دینا بند کردیا۔ سخت مخالفت کے باوجود سکھ دیو اور راج گرو کو پھانسی دے دی گئی۔ اسی سال مئی میں کانگریس کو غیر قانونی پارٹی ٹھہرا کر گاندھی جی جواہر لال نہرو کے علاوہ بھی تمام سرکردہ لیڈر قید کر لئے گئے۔ جس کے نتیجہ میں ملک بھر میں مظاہرے کئے گئے۔ کانگریس کے کراچی اجلاس میں جمہوری طریقے سے راہ عمل طے کرنے کا اعلان ہوا، جس پر سوشلسٹ خیالات کا غلبہ تھا۔ چنانچہ کیمونسٹ پارٹی کی ملک بھر میں دن بدن مقبولیت بڑھنے لگی۔ ۱۹۳۴ء میں آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نرائن نے سوشلسٹ پارٹی قائم کی۔ اس وقت جو ترقی پسند خیالات ور جحانات سامنے آرہے تھے اس کی بنیاد تاریخ ساز واقعہ ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب تھا، جو دراصل ایک عملی پیکر اور اشتراکیت کی تصویر تھا، جس نے جدید ذہن اور شعر وادب کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کیا اور اس کے ساتھ سماجی ارتقاء، تہذیب فلسفہ اور سائنس کو نئی جہت عطا کی۔ کارل مارکس نے ہیگل کے نظریہ سے الگ ہو کر حقیقت کو ازلی اور ابدی حیثیت کا حامل قرار دیا، جو (Effect and Cause) کے باہمی عمل سے نئی شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ مارکس کا نظریہ ہے کہ ہیگل مارے کو جدلیاتی مادیت میں ثانوی حیثیت دیکر اسے سرنگوں کردیا اور انہوں نے دوبارہ اسے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا اور سماجی ارتقا کو سمجھنے کے لئے ٹھوس بنیادیں قائم کیں۔

اشتراکی نظریات روسی ادیبوں کے ذہن میں سرایت کر گئے اور روس سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئے۔ انقلاب روس ۱۹۱۷ء اور جنگ عظیم کے تباہی خیز نتائج کا مشاہدہ کرنے کے بعد کچھ انگریز شاعر وادیب اشتراکی نظریہ کے حامی بن گئے۔ ہندوستان بھی اشتراکیت سے متاثر ہوا یہاں کے سیاسی حالات نے اشتراکی تحریک کے لئے زمین ہموار کی۔ ۱۹۲۶ء میں کانپور میں پہلی آل انڈیا کیمونسٹ کانفرنس ہوئی اور ہندوستان کی سرزمین پر اشتراکی نظریات کی تشہیر و تبلیغ کے لئے کوششیں شروع ہوئیں۔ اردو شعر وادب میں اشتراکی خیالات واضح طور پر ان تمام قلمکاروں کی تحریروں میں، جو ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے

قیام کے بعد سے ادبی تحریک سے وابستہ ہوئے تھے، ابھرنے لگے۔ اس طرح ۱۹۳۵ء تک ہندوستان کی رگ و پے میں گاندھی ازم، سوشل ازم اور کمیونزم خون کی طرح رواں ہوگیا اور ہندوستان کی کوئی تحریک اس سے منحرف ہوکر نہ رہ سکی۔

غرضکہ ۱۹۳۵ء تک اردو ادب جن وسعتوں سے ہم کنار ہوا اور جن انقلابی راہوں سے گزرا بلاشبہ حیرت انگیز تھیں اردو ادب کی پوری تاریخ میں نہ تو کبھی ایسی تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں اور نہ اتنی جلدی اس نے ترقی کی منزلیں ہی طے کی تھیں۔

ادبی پس منظر

مغلوں کی تاراجی اور انگریزوں کے تسلط کے بعد ملک میں سیاسی، معاشرتی اور ذہنی سطح پر جو اثرات مرتب ہوئے اور تبدیلیاں آئیں ان کے اثرات شعر و ادب پر بھی پڑے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد بڑی تیزی سے مغربی ممالک کے تہذیبی، کلچرل اور ادبی اثرات ہندوستان میں نمایاں طور پر نظر آنے گے۔ آزاد دہلی کالج کے طالب علم اور ذوق کے شاگرد تھے، انہوں نے ان نئے رجحانات سے واقف ہوکر نئی اردو شاعری کا خاکہ مرتب کیا اور اگست ۱۸۶۷ء میں اپنے دوستوں اور ہم وطنوں سے اپنی ایک تقریر میں مشرقی شاعری خاص کر اردو فارسی شاعری کے نقائص کی طرف توجہ دلائی۔

بقول اعجاز حسین:

> ''۵ اگست ۱۸۶۷ء کو محمد حسین آزاد کے مبارک ہاتھوں سے ایک انجمن کی بنیاد پڑی، جس میں موصوف نے زبان کے ارتقاء وانقلاب پر ایک مبسوط تقریر کی اور اس تاریخ سے یہ طے کیا کہ ترقی پسند طبقہ کے رجحانات کی تشکیل کیلئے اس انجمن میں شاعروں کا رویہ مروجہ طرز سے الگ ہو بجائے مصرعہ طرح دینے کے موضوع بتائے جائیں۔ غزل کے بجائے لوگ نظمیں کہہ کر لائیں۔''(۱)

---

(۱) نئے ادبی رجحانات-ڈاکٹر اعجاز حسین کتابستان الہ آباد پانچواں ایڈیشن ص ۲

پھر نئی شاعری اور نظم نگاری کی ترویج وترقی کیلئے انجمن پنجاب قائم کر کے موضوعاتی مشاعروں کا اہتمام کیا کرنل ہالرائیڈ اور میجر فلر نے اس انجمن کی سرپرستی کی۔

بقول ڈاکٹر محمد صادق:

''اس طرح نظم نگاری کی تحریک بھی انگریزوں اور انگریزی حکومت کے ہی طفیل میں شروع ہوئی اور یہ اردو زبان کیلئے نیک فال ثابت ہوئی۔ اس سلسلے میں آزاد کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ کرنل ہالرائیڈ نے مشاعروں کے آغاز سے پہلے جسے میں پڑھی گئی آزاد کی مثنوی اور ان کی تقریر کی نقلیں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے تعلیمی محکموں میں بھجوائیں اور یہ درخواست بھی کی کہ انہیں چھپوا کر مدارس میں تقسیم کر دیا جائے تا کہ وہاں بھی اس نئی قسم کی شاعری کی بنیاد ڈالی جائے۔ یا کم از کم اساتذہ کو جدید شاعری کے اظہار خیالات کا موقع ملے۔ اس طرح اردو نظم نگاری کی ابتداء ہوئی اور اسے فروغ حاصل ہوتا رہا۔''(۱)

چنانچہ ۱۸۷۴ء ماہ مئی میں پہلی بار وہ یادگار مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں نئی طرز کی نظمیں پڑھی گئیں۔ قبل مشاعرہ مولانا محمد حسین آزاد نے ایک نہایت مفید اور معلومات افزا خطبہ دیکر شاعری میں اصلیت سے کام لینے اور مقامی رنگ بھرنے اور حقائق حیات کی تصویر کشی کرنے کی طرف شعراء کی توجہ مبذول کرائی۔ اس طرح اردو شاعری کی روایت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ حالی نے بھی آزاد کے دوش بدوش ان مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ غرضکہ حالی اور آزاد کی کوششوں سے اردو شاعری کو قدامت پرستی اور روایتی تقلید سے نکل کر کھلی فضاؤں میں سانس لینے کا موقع میسر آیا آزاد اور حالی نے بھی ان مشاعروں کیلئے کئی موضوعاتی نظمیں لکھیں۔ اس طرح اردو شاعری روایتی موضوعات سے آزاد عام بول چال کی سطح پر گامزن ہوگئی۔ آزاد اور حالی کی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''آزاد اور حالی کو اردو شاعری کے جدید رنگ کا مجدد اور بانی کہنا چاہیے، انہوں

---

(۱) آزاد معاصرین کی نظر میں۔ از ڈاکٹر محمد صادق مطبوعہ سویرا لاہور

نے طرز قدیم کی اردو شاعری پر جس میں تصنع اور تکلف اور خلاف واقعہ باتیں جزو غالب تھیں ضرب کاری لگائی اور اسے تصنع وتکلف اور فرسودہ رسمی روایات سے آزاد کیا۔" (۱)

اسی ضمن میں ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی لکھتے ہیں:

"جدید اردو شاعری کے بانی اور نظم نگاری کے محرک مولانا آزاد تھے۔ اردو زبان وادب پر انہوں نے جو احسانات کئے ہیں، وہ کبھی فراموش نہیں کئے جاسکتے۔ انہوں نے انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ذریعے اردو شاعری کو جو کہ عشق ومحبت کی داستانوں اور معشوق کی زلف گرہ گیر میں الجھ کر اپنی آخری سانسوں کی منتظر تھی آزاد کرانے کی سعی بلیغ کی۔" (۲)

اس سلسلے میں مولانا حالی لکھتے ہیں:

"۱۸۷۴ء میں جب راقم پنجاب بکڈ پو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا، مولوی محمد حسین کی تحریک اور کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا، جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری کو جو کہ دردوبست اور مبالغے کی جاگیر بنی ہوئی تھی اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے۔" (۳)

اردو ادب کو زندگی سے ربط دیکر اور دونوں ادب اور زندگی کے آپسی رشتوں پر غور کرنے کے رجحان کو باقاعدہ طور پر پروان چڑھانے میں سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک نے بڑی تقویت دی۔ اس تحریک کو بھی آگے بڑھانے میں حالی اور آزاد دونوں پیش پیش رہے لیکن اس اصلاحی تحریک کو جلد ہی ایک زبردست رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ سرسید کی انگریزوں سے قربت اور سائنسی نظریات کے سبب اکثر لوگ کھل کر اس

---

(۱) تاریخ ادب اردو ص ۱۰۴ رام بابو سکسینہ۔
(۲) جگت موہن لال رواں حیات اور ادبی خدمات ص ۸۳ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنو ۱۹۸۴ء۔
(۳) دیباچہ مجموعہ نظم حالی دوسرا ایڈیشن الطاف حسین حالی ص ۳۰۱۔

تحریک کی مخالفت کرنے لگے، جن میں اکبرالہ آبادی کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے، ان کا نصب العین سرسید سے مختلف نہیں تھا بس وہ اس طریق کار کے مخالف تھے، اس مخالفت اور عوامی ردعمل نے انسانی فکر کو پھر ایک نئے افق کی تلاش میں سرگرداں کیا اس طرح شاعری میں رومانی رجحانات پرورش پانے لگے۔ حالانکہ انگلستان میں رومانی تحریک کلاسیکی شاعری کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر شروع ہوئی۔ اس میں اجتماعی تصورات کے بجائے انفرادیت اور داخلیت پر زور دیا گیا، جس میں شعراء نے زندگی کی سچائیوں سے انحراف کر کے تصورات اور خوابوں کی دنیا میں اپنی من پسند دنیا بنانے لگے اور رفتہ رفتہ شاعری میں بھی یہ رجحان عام ہوا۔ اس ضمن میں پروفیسر احتشام حسین رقم طراز ہیں:

> ''آزادی کی خواہش نئے اثرات نئے وقوف اور تجدد کے ذوق نے خیالات کو نئی دنیا میں آورد کیا۔ خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں بے تکان اور بے روک ٹوک گل گشت کرنے کے سلسلے میں بہت سی روایتی رکاوٹیں دور ہوئیں اور بہت سے نئے قلعے سر ہوئے اسی کو ہم رومانیت کہہ سکتے ہیں مشکل ہی سے بیسویں صدی کا کوئی شاعر ہوگا، جو رومانیت کے افسوں کا شکار نہ ہوا ہو۔''(۱)

رومانیت کے رجحان کو فروغ دینے والوں میں عظمت اللہ خاں اور اختر شیرانی کا نام سرفہرست ہے۔ ابتدائے بیسوں صدی میں شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، شوق قدوائی، وحیدالدین سلیم، نظم طباطبائی، نادر کاکوروی، سرور جہان آبادی، چکبست اور اکبر وغیرہ حالی اور آزاد کی طرز روش پر گامزن رہے ان شعراء نے ایسی نظمیں تخلیق کیں، جن سے اخلاق سنور سکیں جذبہ قومی اور ملکی کو استحکام ملے اور ایسی نظمیں جن میں مناظر قدرت کی عکاسی کی گئی ہو۔ اس سارے دور کو ہم بنیادی طور پر موضوعاتی دور کہہ سکتے ہیں۔ ویسے تو اس سال کے ربع اول کے نظم نگاروں کی فہرست بہت طویل ہے پھر بھی اس دور میں جو شعراء سب سے زیادہ مقبول ہوئے ان میں اقبال کا نام سرفہرست ہے۔ اقبال نے غالب کے داخلی اور تخلیقی پیرایے کی رعایت کو آگے

---

(۱) جدید ادب منظر پس منظر سید احتشام حسین ص ۱۹۵، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۶ء۔

بڑھایا اور حالی اور آزاد کی روش پر خود بھی گامزن رہ کر اس کو ترقی دی اور اس روایت کو آگے بڑھایا اور اسے پایہ تکمیل تک پہونچا دیا۔ انہوں نے نئے موضوعات اور نظم کی ہیئت کو برقرار رکھنے کے ساتھ غزلیہ روایت کا بھی اثر قبول کیا۔ چنانچہ ان کا شعری رشتہ اپنی شعری روایت سے جڑا ہوا ہے۔ انہوں نے ادب کے افادی پہلوؤں کو بڑھاوا دینے پر زور دیا۔ رومانی تحریک کے بطون سے نکلے ہوئے فن برائے فن کے نظریہ کو اقبال نے مسترد کر دیا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس فن کا تعلق زندگی کی اہم ضرورت یعنی شکم پروری سے نہ رہ جائے اس کو استحکام نہیں ملتا، بقول سعدی شیرازی:

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے فرد کو احمقوں کی جنت سے باہر نکالا اور اسے ایک ایسے فکری اسلوب سے آشنا کیا، جو نہ مغربی افکار کی خوشہ چینی کا عمل تھا اور نہ پدرم سلطان بود کی کیفیت سے سرشار تھا اور نہ جس کی اساس ایک خیالی دنیا ہی پر استوار تھی۔ لہٰذا اردو ادب کی تحریکوں میں اقبال کی تحریک کو بطور خاص بڑی اہمیت حاصل ہے کہ یہ تحریک مزاجاً سرسید کی تحریک سے اثرات قبول کرنے کے باوجود اس سے بھی مختلف تھی اور رومانی تحریک سے بھی۔''(۱)

اقبال نے اردو شاعری میں سب سے پہلے قومی اور ملی مسائل کو اس کے وسیع تناظر میں دیکھا اور اظہار بیان کی نئی نئی جہات تلاش کیں شروع میں ان کی مقبولیت عوام سے زیادہ خواص میں رہی انسان کامل کے تصور اور ان کے خودی کے فلسفے نے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اقبال نے نوجوانوں میں اپنی دنیا خود بنانے کا حوصلہ محبت باہمی کو مسلک کی طرح اختیار کرنے اور مشکلات سے نہ ڈرنے بلکہ بے

---

(۱) نئے تناظر وزیر آغا ص ۵۷/اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد ۱۹۷۹ء۔

خوف وخطر ان سے ٹکرا کر اپنا راستہ ہموار کرنے اور اپنی منزل کی کٹھنائیوں سے نبرد آزما ہو کر تلاش کرنے کا عزم عطا کیا۔ مختصر یہ کہ اقبال نے اردو نظم میں معنوی اور صوری دونوں اضافے کئے اور اس صنف کو نئے امکانات سے آشنا کرایا۔ بقول عقیل احمد صدیقی:

> ''انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کے افراد کے ساتھ ساتھ بعد میں آنے والی نسل کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ اقبال کے آخری زمانے کی نسل ان کے طرز فکر سے زیادہ ان کے طرز اظہار سے متاثر ہوئی۔''(۱)

اقبال کے علاوہ اس دور کے جن دوسرے شاعروں نے اردو نظم نگاری کو فروغ دیا اور اہمیت حاصل کی۔ ان میں جوش، اختر شیرانی، عظمت اللہ خاں، حفیظ جالندھری خاص طور سے نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سبھی شاعروں نے اردو نظم میں فکر وفن کے نئے تجربے کئے اور اپنے زمانے کی نسل کو متاثر کیا۔ ان میں سرفہرست اقبال کے بعد جوش کا نام ہی آتا ہے ان کی شاعری تین اہم موضوعات میں تقسیم کی جاسکتی ہے: (۱) مناظر فطرت کی عکاسی (۲) حسن وعشق کا بیان (۳) انقلاب۔ اگر بنظر غائر دیکھیں تو جوش کا انداز بیان ان سبھی موضوعات میں جذباتی نظر آتا ہے وہ اقبال کی طرح موضوعات کی گہرائی میں نہیں اترتے حالانکہ وہ زبان وبیان پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جوش اردو نظم نگاری میں ''ایجی ٹیشن'' کے ایجاد کرنے والے ہیں خاص کر انقلابی نظموں میں ان کا لہجہ انداز خطابت اور بلند آہنگی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ ترقی پسند اردو نظم پر ان کے لہجہ کی گہری چھاپ ہے۔ پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

> ''ان کی خطیبانہ شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے انقلابی شاعری میں ملتے ہیں یہ وہی لہجہ ہے، جو فکری سیاق وسباق کی تبدیلی کے ساتھ اقبال کے یہاں سے ہوتا ہوا جوش تک پہنچتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جوش نے اس لہجے میں نرالا جوش اور آزادی وطن کے لئے جہاد کا جنون بھر دیا اور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۰ء تک پوری شاعری جوش کی روایت کے

---

(۱) جدید اردو نظم نظریہ وعمل عقیل احمد صدیقی ص ۱۴۶ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۰ء۔

سائے میں پروان چڑھی، اس میں سردار جعفری، مجاز، مخدوم، جاں نثار اختر،
پرویز شاہدی سبھی شامل ہیں۔''(۱)

اس دور کے جن شاعروں نے اسلوب اور ہیئت کے تجربے کئے ان میں سب سے خاص نام عظمت اللہ خاں کا ہے، جو غزل کے متعلق اپنے باغیانہ تصور کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''غزل کی گردن بلا تکلف ماردی جانی چاہئے۔'' اس بات کی اہمیت صرف یہ ہے کہ انہوں نے مغربی شاعری سے آگاہی کی بنا پر اردو نظم میں داخلی اور خارجی عوامل کو بدلنے کی کوشش کی وہ عربی فارسی عروض کے بجائے پنگل سے استفادہ چاہتے تھے۔ وہ نظم کو فارسی لفظیات اور لب ولہجہ سے یکسر دور رکھنے کی کوشش کرتے رہے ان کی اس روش کے بارے میں عقیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

عظمت اللہ خاں کا اصل مقصد اردو شاعری کو ہندوستانی روح سے ہمکنار کرنا تھا۔ ان کی عشقیہ نظموں میں عورتوں کی طرف سے اظہار عشق ملتا ہے، جو دراصل اس ہندوستانی روح کی بازیافت ہے، جو ہند اسلامی تہذیب کی تشکیل سے پہلے ہندی یا سنسکرت شاعری کا خاص مزاج رہا ہے، عظمت اللہ خاں کے ان تجربوں کا خاص اثر میراجی نے قبول کیا اور ان کے توسط سے ایک پوری نسل متاثر ہوئی۔''(۲)

حفیظ جالندھی کا بھی ایک اہم مقام ہے انہوں نے ابتدا میں اچھی رومانی اور وطنی نظمیں لکھیں کچھ نظم نما گیت اور کچھ گیت نما نظمیں تحریر کیں لیکن بقول علی سردار جعفری:

''اقبال بننے کی خواہش نے ان کی شاعری کا گلا گھونٹ دیا۔''(۳)

اس طرح آزاد اور حالی کی نیچرل شاعری کی اصلاحی تحریک سے لیکر ۱۹۳۵ء تک کا عرصہ اردو نظم کی تشکیل کا دور ہے، اس عرصے میں اردو نظم اس لائق ہوئی کہ اس کو علاحدہ صنف کا نام اور حیثیت دی جا سکے

---

(۱) معاصر ادب کے پیش رو-محمد حسن ص ۱۸-۱۹، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی ۱۹۸۲ء۔
(۲) جدید اردو نظم نظریہ و عمل عقیل احمد صدیقی ص ۱۴۸ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۰ء۔
(۳) ترقی پسند ادب علی سردار جعفری ص ۱۷۴/۱ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۱ء۔

اور اتنی وسعت پیدا ہوئی کہ اس میں زندگی کے تمام تجربات پیش کیے جاسکیں اس دور میں نظم کی خارجی اور داخلی دونوں صورتیں بدل گئیں۔ غیر مقفیٰ نظم، نظم معریٰ اور نیم پابند نظم کی ہیئت اردو شاعری میں دخل پانے لگی۔ اس دور میں اقبال کی فلسفیانہ شاعری کو عروج ملا۔ اقبال نے جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، اردو نظم کو صوری اور معنوی امکانات سے روشناس کرایا۔ اسی زمانے میں عظمت اللہ خاں نے نظم کے لئے ایک مختلف اور غیر روایتی ڈھانچہ پیش کیا اور سب سے پہلے اردو نظم کو غزل کے اثرات سے دور رکھنے کی دانستہ کوشش کی۔ چنانچہ اب اردو نظم اس قابل ہو چکی تھی کہ اس میں زندگی کا ہر تجربہ اور ہر خیال بیان کیا جاسکے۔ اس پس منظر میں ترقی پسندوں کی نسل وجود میں آئی اور انہوں نے اردو نظم سے وہ سب کام لئے، جن کیلئے اردو جیسے انتظار ہی کر رہی تھی۔

ترقی پسند تحریک اور اس کے اغراض ومقاصد

اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے بعد یہ دوسری اہم اور سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظم تحریک تھی، جس کی کوششیں شعوری اور جس کا مقصد واضح تھا۔ ادب لطیف کے رجحان اور حسن پرستی کی شدت کے خلاف یہ ایک نئی طرح کا شدید ردعمل تھا۔ اس تحریک نے علی گڑھ تحریک کی عقلیت، مادیت اور اجتماعیت کو ایک نئی شکل دی۔ فطرت پرستی کے رجحان میں حقیقت نگاری کا رنگ بھرا گیا اور ان تمام قدیم اور بعض فرسودہ قدروں سے بغاوت کا اعلان کیا گیا جو ترقی پسند نہیں تھیں۔ دراصل اس تحریک کا مقصد ومسلک ہی اشتراکی اور عوامی انقلاب تھا۔ اگرچہ اس تحریک نے اپنا رشتہ ملکی آزادی کی جدوجہد اور جمہوریت سے استوار کیا۔ مگر بہت جلد یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ اس تحریک کا اصل مقصد اشتراکیت کا پرچار تھا اور یہ ادب سے زیادہ اشتراکیت کی نقیب بن گئی۔ بقول سید سجاد ظہیر:

''ہم اعلانیہ اور دانستہ طور پر ترقی پسند تحریک کا رشتہ ملک کی آزادی او رجمہوریت سے جوڑنا چاہتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ترقی پسند دانشور مزدوروں

اور کسانوں غریب اور مظلوم عوام سے ملیں۔ ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں۔ ان کے جلسے اور جلوسوں میں جائیں، انہیں اپنے جلسے اور جلوسوں میں بلائیں۔ اسی لئے ہم اپنی تنظیم میں اس پر زور دینا چاہتے تھے کہ دانشوروں کیلئے ادبی تخلیق کے ساتھ عوامی زندگی سے زیادہ سے زیادہ قرب ضروری ہے۔ بلکہ نیا ادب اس کے بغیر پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔'' (۱)

انجمن ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامے میں اعلان کیا گیا تھا کہ:

''ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائے، جس کیلئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔''

ہم ان تما آثار کی مخالفت کریں گے، جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ ہم ان تمام قوتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں او رارادوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تعمیر اور ترقی کا ذریعہ قبول کرتے ہیں۔'' (۲)

گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر میں اس اعلان نامے کی مزید وضاحت ملتی ہے:

''ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں، جس سے خاندان، مذہب، جنس جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے

---

(۱) روشنائی از سجاد ظہیر آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۹ء ص ۶۱
(۲) نیا ادب لکھنؤ خاص نمبر جنوری۔فروری ۱۹۴۱

ادبی رجحانات کو نشو ونما دینے سے روکیں، جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی
استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔(۱)

ترقی پسند ادب کی فکری بنیادیں

اردو میں ترقی پسند نظریہ کی تحریک دراصل ان چند ہندوستانی نوجوانوں کے سوشلزم سے متاثر ذہنوں کی اختراع تھی، جو لندن میں زیر تعلیم تھے اور یورپ میں فاسشزم کے خلاف احتجاج کرنے والی قوتوں سے بھی شدید طور پر اثر قبول کر رہے تھے۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام سے سیاست ان کو نفرت اور کارل مارکس کے اقتصادی فلسفے کی بنیاد پر روس میں قائم ہونے والے اشتراکی سماج سے ان کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی اس تحریک کے قائد سجاد ظہیر نے اپنی ڈائری میں اس وقت کی ذہنی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے۔ ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا، جو ہمیں سماج کے دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کو سلجھانے میں مدد دے سکے، ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں رہی ہیں اور رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں جیسے جیسے ہم اپنے مطالعہ کو بڑھاتے آپس میں بحثیں کرتے، تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے، اس نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوئے اور ہمارے قلب کو سکون ہو جاتا تھا۔''(۲)

اس ذہن کے ساتھ ترقی پسند ادب کا لائحہ عمل طے کیا گیا۔ لازماً اس کی پہلی بنیاد عوامی اور اجتماعی زندگی کی ترجمانی پر رکھی گئی۔ یعنی ادب اجتماع یا عوام کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس تصور کے تحت اردو ادب کی دو

---

(۱) سہ ماہی گفتگو ممبئی ترقی پسند ادب نمبر مرتبہ علی سردار جعفری ص ۱۹......

(۲) ''یادیں'' سجاد ظہیر نیا ادب خاص نمبر لکھنؤ جنوری۔فروری ۱۹۴۱ء

خصوصیات بتائی گئیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہ راست تعلق رکھتا ہو دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے۔"(۱)

ترقی پسند تحریک کا پس منظر

ترقی پسند تحریک کا ادبی پس منظر اقبال، سرور، چکبست، اکبر اسماعیل، شرر اور ظفر علی خاں تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کا آغاز بین الاقوامی سرحدوں میں داخل ہو رہے تھے اور دنیا میں ہونے والے انقلابات اور حالات کا اثر عام ملکوں پر سایہ فگن تھا۔ ۱۹۱۷ء کے روس کے انقلاب کا اثر عوامی تحریکوں کی صورت میں ساری دنیا پر پڑا۔ روس کے انقلاب کی سرحدوں سے گزر کر اشتراکیت کے اثرات چاروں طرف پھیلا دئے۔ چنانچہ لندن میں مقیم پڑھنے والے ہندوستانی طلباء بھی اس سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں جرمنی میں ہٹلر کی رہنمائی میں فاسشزم کی جس رو نے سر اٹھایا تھا۔ اس سے نہ صرف پوری یورپ کو سیاسی بحران سے گزرنا پڑا بلکہ اس کے خلاف محاذ بنانے والوں میں ہر طرف سے کھینچ کر لوگ پیرس میں کلچر اور تمدن کے تحفظ کے نام پر اکٹھا ہوئے۔ جہاں طے پایا گیا کہ ادیبوں اور شاعروں کو اپنے ذاتینہاں خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب وثقافت کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کیلئے رجعت پسند قوتوں کا مقابلہ کرنا چاہئے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کیلئے وقف کر دینا چاہئے چنانچہ ۱۹۳۵ میں پیرس کی اس کانفرنس سے جو World congress of the Writers for hte defence of Culture کے نام سے جانی جاتی ہے، لندن میں پڑھنے والے ہندوستانی طالب علموں کی ترقی پسند ادبی کوششوں کو بڑا بڑھاوا ملا۔ سجاد ظہیر نے یورپ کے قیام کے زمانے میں پی ایف ناکس اور لوئی آراگوئی جیسی ادبی شخصیتوں سے ملاقات کی۔ انہوں نے ترقی پسند ادبی تحریک کیلئے ان کی ہمت افزائی کی۔(۲)

---

(۱) افادی ادب- از اختر انصاری ص ۲۸

(۲) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۳۵-۲۴

ایک طرف یہ بین الاقوامی حالات تھے، اور دوسری طرف ملکی سیاست میں بھی ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک خصوصاً انڈین نیشنل کانگریس میں دو گروہ تحریک آزادی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے کیلئے ابتدا ہی سے برسر کشمکش تھے۔ عوام کے باغیانہ جذبہ اور جوش کی نمائندگی گرم دل کے لوگ کر رہے تھے، جس میں اربند گھوش، بپن چندر پال، جواہر لال نہرو، لالہ لاجپت رائے اور بال گنگا دھر تلک شامل تھے اور دوسرے نرم دل کے رہنماؤں میں مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو، گوپال کرشن گوکھلے، فیروز شاہ مہتا اور دوسرے رہنما تھے۔ ۱۹۰۸ میں تلک کو اپنے اخبار میں ایک انقلابی مضمون لکھنے کے جرم میں چھ سال کی قید کی سزا دی گئی۔ اور جنگ عظیم اول کی ابتدا تک وہ مانڈلے (برما) میں قید رہے۔ ان کی گرفتاری پر ممبئی میں مزدوروں کی زبردست ہڑتال ہوئی۔ روس کے اشتراکی رہنما لینن نے اس ہڑتال کو خوش آمدید کہا۔ (۱)

۱۹۱۸ میں دوبارہ ہڑتال ہوئی اور جنوری ۱۹۱۹ء تک اس میں سوا لاکھ مزدور شریک ہوئے۔ ۱۹۲۰ء کے چھ مہینوں میں ملک میں تقریباً دوسو ہڑتالیں ہوئیں، جن میں پندرہ لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا۔ (۲)

اسی زمانے میں جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے سبب انگریز سامراجیت کے خلاف جلسوں، جلوسوں، ہڑتالوں اور دھرنوں کا جوش وخروش ایک قیامت کی شکل اختیار کر گیا۔ دوسری طرف ولایتی مال کا بائیکاٹ ہو رہا تھا۔ جابجا سوادل قائم ہو رہے تھے۔ حکومت نے ان کو غیر قانونی قرار دیا اور ہزاروں کی تعداد میں مزدور کارکن اور طالب علم جیلوں میں بھر گئے۔ ۱۹۲۰ء میں ترک موالات آندولن کے سبب ۱۹۲۱ء کے شروع تک تقریباً ۳۰ ہزار ہندوستانی مختلف جیلوں میں بند، قید وحوالات کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔

۱۹۲۱ء میں احمد آباد کانگریس کے موقع پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ایک اعلان نامے کے ذریعہ

---

(۱) اردو ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۳۰

(۲) ''انڈیا ٹوڈے'' رجنی پام دت ص ۵۰۵

مطالبہ کیا کہ کانگریس مزدور سبھاؤں کے مطالبات کو فوراً اپنا مطالبہ بنا لے تا کہ عوام کی نا قابل مزاحمت قوت ملک سے سامراجیت کا نام ونشان مٹا دے۔ مزدوروں اور کسانوں کی سبھائیں اپنے سیاسی مطالبات کیلئے جدو جہد کر رہی تھے۔ ۲۷-۱۹۲۶ء میں جگہ جگہ ٹریڈ یونینیں بننے لگیں ان سب چیزوں کا اثر کانگریس پر بھی پڑا۔ ۱۹۲۷ میں پنڈت نہرو جب یورپ کے دوسرے دورے پر گئے تو اشتراکیت کا اثر اپنے ساتھ لائے۔

ان حالات سے اردو ادب نہ صرف متاثر تھا بلکہ اردو شعروادب میں ایک تہلکہ مچ گیا تھا۔ علامہ اقبال کے وطنی گیت، چکبست کی ولولہ انگیز قومی شاعری، سرور جہان آبادی اور دوسرے نظم نگاروں کی رشحات فکر ملکی آزادی اور سامراجی دشمنی کی آگ دلوں میں بھڑکا رہے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ ''سوز وطن'' شائع ہوا تو حکومت نے اسے ضبط کر لیا اور اس کی ساری کاپیاں جلا دی گئیں۔ ۱۹۱۴ء میں ہنگامہ بلقان پر شبلی کی نظم ضبط کر لی گئی۔ اقبال کی شاعری میں سرمایہ دار اور محنت کش کی کشمکش پر اظہار خیال ہونے لگ۔ خضر راہ میں انقلابی نکتہ نظر کی حمایت ملتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی حیلہ گری کے مقابلے میں مزدور طبقے کو مستعد ہونے کا پیغام دیا گیا۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخ امرا کے درو دیوار ہلا دو

جیسے شعر کہے جا رہے تھے، اور لینن خدا کے حضور میں اور ساقی نامہ جیسی نظمیں انقلاب کا پیغام دے رہی تھیں۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

گیا دور سرمایہ داری گیا

تماشا دکھا کر مداری گیا

ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

جوش، سیماب، روش، ساغر، حفیظ، جمیل مظہری اور احسان دانش وغیرہ شعراء کی قومی سیاسی اور باغیانہ نظمیں جوش وخروش کا ایک ماحول پیدا کئے ہوئے ہیں۔لوگ یوروپ کے انقلابات خصوصاً روس کے انقلاب سے بھی متاثر تھے اور انہیں موضوعات پر کتابیں پڑھنا ان کا شغل تھا۔۱۹۳۲ء میں لکھنؤ سے ''انگارے'' کی اشاعت ہوئی، جس میں انقلابی اور باغیانہ خیالات کی لے کافی تیز تھی۔ان میں مروجہ اخلاقی عقائد اور مذہب پر طنز اور تمسخر کا رنگ اتنا گاڑھا تھا کہ مسلمانوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔حکومت نے اس مجموعے کو ضبط کرلیا۔لیکن بقول ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی:

> ''اس مجموعے کی اشاعت اس بات کی خبر دیتی تھی کہ ہندوستانی نوجوانوں میں ذہنی اور جذباتی طور پر کچھ ایسی تبدیلیاں ہورہی تھیں جن سے ہمارے ادب کو جلد ہی دوچار ہونا تھا۔''(۱)

> ''ملک کے ان سیاسی اور ادبی حالات میں سجاد ظہیر صاحب نے انجمن ترقی پسند مصنفین کا منشور اور ہندوستان میں اس کے قیام سے متعلق خاکوں کو ذہن میں رکھ کر ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کے ساحل پر لندن کے ہم خیال طالب علموں میں سب سے پہلے قدم رکھا۔''(۲)

مختلف مذہبی اور سماجی تحریکوں کی ایک صدی کی مسلسل کوششوں سے ہندوستانی عوام میں ذہنی بیداری پیدا ہوگئی تھی ان کی فکر کا دائرہ ہندوستان سے بڑھ کر ساری دنیا میں پھیل چکا تھا، انقلاب روس سے ترقی پسند خیالات اور سوشلسٹ نظریات بڑھنے لگے تھے۔۱۹۳۲ء میں ہٹلر نے جرمنی میں فاشزم کا ایک زبردست ہیجان پیدا کردیا تھا۔اس خطرناک صورت حال کے اثرات ہندوستان کے ان سرفروشوں پر بھی پڑے جو جدوجہد آزادی میں مصروف تھے، اور خصوصاً ان ہندوستانیوں پر جوان دنوں اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ میں مقیم تھے ان میں انگارے کے سرگرم مصنفین میں سے سید سجاد ظہیر بھی تھے ان کے علاوہ ملک راج آنند، محمد

(۱) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۳۰۔
(۲) روشنائی از سجاد ظہیر ص ۱۲

دین تاثیر، جیوتیگھوش اور پرمود سین گپتا بھی موجود تھے۔ سجاد ظہیر کے مطابق ''ایسی عجیب وغریب صورت حال سے بچنا ہم یورپ میں مقیم نوجوانوں کے لئے ناممکن تھا ہماری رگوں میں گرم خون جوش مار رہا تھا اور ہم لوگ اپنے مقاصد کی تلاش میں صحیح سمت سفر کے متلاشی تھے، وہ لکھتے ہیں:

''ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے۔ ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا، جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سلجھانے میں مدد دے سکے ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ آفتیں اور مصیبتیں رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ مارکسی اور دوسرے مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں، جیسے جیسے ہم اپنے مطالعہ کو بڑھاتے آپس میں بحثیں کر کے تاریخی سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے۔ اس نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ہوجاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک لامتناہی تحصیل علم کی ابتدا تھی۔ ہمارے چھوٹے سے گروہ میں اکثر مصنف بننا چاہتے تھے اور کرتے بھی کیا۔ مزدوری کرنے کی ہم میں اہلیت نہ تھی کسی قسم کا ہنر ہم نے سیکھا نہ تھا، سامراجی سرکار کی نوکری کے خیال سے گھن آتی تھی تو پھر باقی کیا رہا۔''(۱)

غرض کہ لندن میں مقیم ان نوجوان ہندوستانیوں نے شدت سے محسوس کیا کہ وطن سے اتنی دور رہ کر ہندوستانی ادب کو اہم تبدیلیوں سے روشناس نہیں کیا جاسکتا، اس ضمن میں سید سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

''سب سے بڑی بات جو ہم نے اس زمانے میں یورپ میں سیکھی، وہ یہی تھی کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک اس وقت بارآور ہوسکتی ہے، جب ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کی ترویج ہو اور جب ہندوستان کے ادیب اس تحریک کی ضرورت کو سمجھ کر اس کے مقاصد کو عملی جامہ پہنائیں۔''(۲)

---

(۱) ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری یعقوب یاور ص ۱۵۳ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۷ء۔
(۲) ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری یعقوب یاور ص ۱۴۵ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۷ء۔

چنانچہ آپسی مشوروں کے بعد اس بارے میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ لندن میں تیار کردہ انجمن کے منشور کی نقول ہندوستان میں مختلف قلم کاروں اور دوستوں کو بھیجی گئیں۔ ان میں پریم چند، علی گڑھ یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر اشرف ایم اے او کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمود الظفر اور ان کی اہلیہ رشید جہاں کلکتہ کے ہیرن مکرجی الہ آباد یونیورسٹی کے انگریزی کے لیکچرر احمد علی، مشہور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، حیدر آباد کے سبط حسن کے نام خاص طور سے لائق ذکر ہیں۔ اس منشور کا پریم چند نے سب سے پہلے خیر مقدم کیا۔ اس کا خلاصہ اپنے رسالہ ہنس میں شائع کیا اور اس پر اداریہ بھی تحریر کیا، انہوں نے یہ بھی واضح طور پر لکھا کہ اگر یہ انجمن قائم رہی تو ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ لندن سے بھیجے گئے اس منشور پر سجاد ظہیر، جیوتی گھوش، ملک راج آنند، ایس سنہا، کے ایس بھٹ اور محمد دین تاثیر کے دستخط تھے۔ ہندوستان میں اس اعلان نامہ کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ اس کو دیکھ کر سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کو بڑا حوصلہ ملا۔ ۱۹۳۵ء کے اختتام سے پہلے سجاد ظہیر اپنی تعلیم پوری کر کے ہندوستان واپس آ گئے اور یہاں آ کر انہوں نے انجمن کے قیام کا کام شروع کیا۔ الہ آباد جا کر انہوں نے ڈاکٹر اعجاز حسین، فراق گورکھپوری، احمد علی، احتشام حسین، وقار عظیم کے علاوہ ہندی زبان کے دو ادیبوں شیو دھان سنگھ چوہان، نریندر شرما کے تعاون سے ترقی پسند مصنفین کا ایسا حلقہ بنایا، جس میں اردو ہندی دونوں زبانوں کے ادیب اور قلمکار شامل تھے۔ اسی سال دسمبر ۱۹۳۵ء میں ہندی اور اردو دونوں کے ادیبوں کی ایک کانفرنس ہندوستانی اکادمی الہ آباد میں منعقد ہوئی، جس میں مولوی عبدالحق، منشی پریم چند، جوش ملیح آبادی، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے مولانا عبدالسلام ندوی، زمانہ کانپور کے مدیر منشی دیا نرائن نگم اور حیدر آباد کے ڈاکٹر محی الدین قادری جیسی اہم شخصیات الہ آباد آ کر اس کانفرنس میں شامل ہوئیں۔ ان بزرگوں کی حوصلہ افزائی کے بعد سجاد ظہیر نے امرتسر اور لاہور کا دورہ کیا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی اس سلسلے میں روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''تھوڑے ہی عرصہ میں لاہور علی گڑھ حیدر آباد کلکتہ اور امرتسر کے علاوہ صوبہ

بہار میں ترقی پسند مصنفین کی انجمنیں قائم ہو گئیں، جن سے وابستہ ہونے اور جن کی ترویج
واشاعت کے کاموں میں حصہ لینے والوں میں اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر محمود الظفر،
حیات اللہ انصاری، فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، ڈاکٹر عبد العلیم، سردار جعفری، ڈاکٹر
رشید جہاں، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، سبط حسن، اختر اورینوی، جاں نثار اختر، خواجہ احمد
عباس، سہیل عظیم آبادی، شاہد لطیف، فیروز الدین منصور، میاں افتخار الدین او رتمنائی
وغیرہ شامل تھے۔"(۱)

سجاد ظہیر اوران کے ساتھیوں کی کامیابی کی خاص وجہ یہ تھی کہ لندن میں انجمن کے قیام سے پہلے ہندوستان میں ترقی پسند رجحانات نظر آنے لگے تھے اور ایک انجمن کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ اس بارے میں اختر حسین رائے پوری کا مضمون ساہتیہ اور کرانتی اپریل ۱۹۳۳ء میں ہندی ماہنامہ وشوامتر کلکتہ میں شائع ہو چکا تھا جو بعد میں چند اہم تبدیلیوں کے ساتھ ادب اور زندگی کے عنوان سے رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا، جس میں ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ضرورتوں سے متعلق مدلل انداز میں بحث کی گئی تھی۔

ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس کل ہند پیمانے پر لکھنؤ میں ۱۰راپریل ۱۹۳۶ء کو رفاہ عام کلب کے ہال میں ہوئی، چودھری محمد علی ردولوی صاحب طرز مصنف کو اس کا صدر بنایا گیا جو عمر رسیدہ اور ترقی پسند تحریک کے حامی تھے۔ اس کانفرنس میں پریم چند، حسرت موہانی، جے پرکاش نرائن، یوسف مہر علی، کملا دیوی چٹو پادھیائے، میاں افتخار الدین، اند لال یا جنگ اور جتیندر کمار وغیرہ شامل تھے، ان کے علاوہ گجراتی، بنگالی، مراٹھی اور تامل زبان کے کچھ ادیبوں نے بھی شرکت کی تھی اور اپنی اپنی زبانوں میں ادب کی صورت حال اور مسائل پر تقریریں کی تھیں اسی زمانہ میں لکھنؤ میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ جلسہ بھی ہو رہا تھا، جس کی وجہ سے انجمن کو سیاسی رہنماؤں کا تعاون بھی مل گیا، ہنس راج رہبر کے مطابق:

---

(۱) ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ ڈاکٹر صادق ص ۶۱ ر اردو مجلس دہلی ۱۹۸۱ء۔

''اب تنظیم کا مقصد چونکہ ادیبوں کا سیاست سے عملی اور مستقل رشتہ قائم کرنا تھا اس لئے مدعو کرنے والوں نے جان بوجھ کر یہ ادبی کانفرنس ان دنوں لکھنؤ میں کی، جب کانگریس کا اجلاس بھی وہیں ہو رہا تھا۔''(۱)

لکھنؤ کی یہ کانفرنس اردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم، سجاد ظہیر، اور محمود الظفر کا تیار کردہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا دستور اساسی پیش کیا ہے، جسے بہ اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ انجمن کا نیا اعلان نامہ اور منشی پریم چند کا خطبہ صدارت خصوصی اہمیت رکھتے ہیں اس لئے کہ یہ اردو ادب کی سست رفتار میں زبردست تبدیلی کا پیش خیمہ آگے چل کر ثابت ہوا۔ وہ اعلان نامہ مختصراً یہ ہے:

''اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جاں بہ لب رجعت پرستی جسکی موت لازمی ہے اور یقین ہے اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فرار کا شکار رہا ہے۔ اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈھ رہا ہے، جس کی باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے اور ادب شدید قسم کی ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔

ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں، جس سے خاندان، مذہب، جنس جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے، ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو و نما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔

(۱) ترقی پسند ادب - ایک جائزہ ہنس راج رہبر ص ۳۳ آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۷۶ء۔

ہماری انجمن کا مقصد ادب و آرٹ کو ان رجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے، جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس اعلان نامے کے ساتھ درج ذیل چار مقاصد پیش کئے گئے:

(۱) ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشوراتی جلسے منعقد کر کے اور اس کے لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

(۲) ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

(۳) ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادی رائے اور آزادی خیال کی حفاظت کرنا۔(۱)

اس کانفرنس کا خطبہ صدارت جو پریم چند نے دیا وہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی طرح ہے، اس خطبہ سے ترقی پسند تحریک کو بہت زیادہ تقویت نصیب ہوئی، پروفیسر قمر رئیس کے مطابق:

''اس میں پریم چند نے جو خطبہ پڑھا وہ ترقی پسند نظریہ ادب کی وضاحت کے سلسلے میں ان کے منشور سے بھی زیادہ موثر اور جامع ثابت ہوا۔''

جس کے بارے میں سجاد ظہیر کا خیال تھا کہ:

> ''ترقی پسند ادبی تحریک کی غرض وغایت کے متعلق شاید اس سے بہتر کوئی چیز ابھی تک نہیں لکھی گئی۔''(۲)

اس خطبہ میں نئے ادیبوں کو نئے زمانے کے ادبی تقاضوں کو پورا کرنے اور سماج سے رشتہ جوڑے رہنے کی بھرپور تلقین کی گئی تھی۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف

---

(۱) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۴۱/ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۶ء۔

(۲) روشنائی از سجاد ظہیر ص ۱۲۳۔

زور دیا کہ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرلے اس میں خیالات وجذبات ادا کرنے کی صلاحیت کہاں سے پیدا ہوسکے گی۔اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کرلی ہے، کہ زندگی سے گزر کر اس کے معنیٰ پر بھی غور کیا جائے کہ جس منشاء سے یہ بنی ہے وہ کیونکر پورا ہو، وہی زبان جو شروع میں باغ و بہار اور بے تال پچیسی کی تصنیف ہی معراج کمال تھی اب اس قابل ہوگئی کہ علم وحکمت کے مسائل بھی ادا کرے اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔''(۱)

پریم چند نے ادب کی تعریف اور مقاصد کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا:

''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، لیکن اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے چاہے وہ مقالوں کی شکل ہو یا افسانوں کی یا شعر۔ ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہئے۔'' ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی محبت نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخلیقات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانہ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستان خیال کی اور چندر کانتا سنتتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبہ حیرت کی تسکین۔(۲)

ادبی جمالیات پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا:

''لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں اس میں کلام ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ مسلم تھا، قصہ قصہ ہے، زندگی زندگی، دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ شعراء پر انفرادیت کا رنگ غالب تھا، عشق کا معیار نفس پروری تھا اور حسن کا دیدہ زیبی، انہیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعراء اپنی جدت اور جولانی کے معجزے دکھاتے تھے............۔'' ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن

---

(۱) اردو ادب پچاس سالہ سفر-قمر رئیس عاشور کاظمی ۱۶۳-۱۶۴-۴۵/ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۴ء۔
(۲) اردو ادب پچاس سالہ سفر-قمر رئیس عاشور کاظمی ۱۶۳-۱۶۴-۴۵/ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۴ء۔

سے وابستہ رہنا چاہئے تھا انہیں کی قدر دانی پر اس کی ہستی قائم تھی، اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا، اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں، جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے، انہیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔

.... آرٹ نام ہے محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں، زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔'' (۱)

پریم چند نے ہی اس خیال کو بھی ظاہر کیا کہ:

''ہمارا ادب اس وقت قابل قدر ہو سکتا ہے جب وہ اپنے عہد کے گونا گوں مسائل کو سمجھ کر فنکارانہ اظہار کرے۔ انجمن ترقی مصنفین کے قیام اس کی نوعیت اور مقاصد کی وضاحت بھی انہوں نے کھل کر کی۔ انہوں نے ترقی پسند مصنفین جیسے نام سے اختلاف کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات یہ کہی کہ ''ادب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقاً ترقی پسند ہوتا ہے اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور باہر بھی، اس کمی کو پورا کرنے کیلئے اس کی روح بے قرار رہتی ہے۔'' (۲)

اپنے خطبہ صدارت کے آخر میں انہوں نے پرزور الفاظ میں کہا:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا، جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔'' (۳)

پریم چند کے خطبہ صدارت کے بعد احمد علی نے ترقی پسند ادب پر مقالہ پڑھا، جس میں انہوں نے اس تحریک کے اصولوں اور مقاصد سے بحث کی تھی۔ اس مقالے میں انہوں نے اقبال اور ٹیگور کو رجعت پسند

(۱-۲) اردو ادب پچاس سالہ سفر۔ قمر رئیس عاشور کاظمی۔۱۶۳-۱۶۴-۴۵-۱ ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۱۹۹۴ء۔

(۳) اردو ادب میں ترقی پسند تحریک۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۴۰ ؍ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۲ء۔

قرار دیا تھا۔فراق نے اپنے مقالے میں ہندوستان کی مختلف ادبی اور سماجی تحریکات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند تحریک بھی ہندوستان کی تہذیب کے ارتقاء ہی کا ثمرہ ہے۔اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں مولانا حسرت موہانی اور کملا دیوی چٹوپادھیائے نے پرجوش لفظوں میں ترقی پسند مصنفین کی ضرورت اور اہمیت اور ان کے اعلان نامے سے مکمل اتفاق کا اظہار کیا۔حسرت موہانی نے اشتراکیت کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

''محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے، جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہئے۔اسے انقلابی ہونا چاہئے اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں، اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں، چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے، اس لئے ترقی پسند ادیبوں کو انہیں خیالات کی ترویج کرنا چاہئے۔''(۱)

جلد ہی اس تحریک کو ہندوستان کی تمام زبانوں میں مقبولیت حاصل ہوگئی۔ٹیگور، اقبال، عبدالحق، پریم چند، جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، آچار نریندر دیو اور جے پرکاش نرائن وغیرہ مختلف ادیبوں اور سیاست دانوں نے ترقی پسند تحریک کے اصول ونظریات اس کے اغراض ومقاصد سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے اس تحریک کی ہمت افزائی کی۔اس موقع پر سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف نے لاہور کا سفر کیا۔علامہ اقبال سے ملاقات کی علامہ اقبال نے فرمایا کہ:

''ظاہر ہے مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے، آپ لوگ مجھ سے ملتے رہئے۔''(۲)

اس طرح انجمن ترقی پسند مصنفین کو وہ سارے وسائل مل گئے، جو کسی تحریک کو مقبول بنانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں اور اس تحریک کی مقبولیت میں ہندوستان گیر پیمانے پر تیزی آئی اور ملک کے ہر کونے

---

(۱) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۴۶ / ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۲ء۔

(۲) ''روشنائی'' سجاد ظہیر صح ۳۲-۱۳۲

سے نوجوان ادیب وفنکار خود کو اس تحریک کا رکن بننے میں فخر محسوس کرنے لگے۔

ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیبوں نے بھی ترقی پسند ادبی انجمنیں قائم کیں۔ کلکتہ، سلہٹ، گوہاٹی، ناگپور، پونا، احمد آباد، مالا بار اور زیجواڑہ کے علاقوں بھی اسی طرح کی انجمنیں مختلف زبانوں میں قائم ہوئیں اور تحریک ملک گیر حقیقت اختیار کرلی۔

۱۹۳۷ء میں ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد میں ایک اور کانفرنس کی، جس میں اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب اور ترقی پسند سیاسی رہنما نے بھی شرکت کی۔ جن میں جے پرکاش نرائن، شنیو دان سنگھ، چوہان، سریندر شرما، رمیش چندر سنھا، آچاریہ نریندر دیو اور رام نریش ترپاٹھی قابل ذکر ہیں۔ اس کانفرنس میں اگرچہ مولوی عبدالحق شامل نہ ہوسکے لیکن اپنا خطبہ صدارت بھیج دیا، جو پڑھ کر سنایا گیا۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں الہ آباد میں پھر ایک دوسری بڑی کانفرنس ہوئی، جس میں یوپی، بہار اور پنجاب کے بہت سے ادیبوں نے شرکت کی۔ فیض احمد فیض، ڈاکٹر عبدالعلیم، حیات اللہ انصاری، مجاز لکھنوی، سردار جعفری، آنند نرائن ملا، امرت رائے شاہد لطیف اور علی اشرف خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مقامی ادیبوں میں فراق، ڈاکٹر اعجاز حسین، سید احتشام حسین اور سید وقار عظیم خاص تھے، مجلس صدارت کیلئے سمترانند پنت کے نام کا انتخاب کیا گیا۔ اس کانفرنس میں گجراتی ادیب کاکا کالیکر اور پنڈت جواہر لال نہرو نے تقریریں کیں، رویندر ناتھ ٹیگور نے اپنا پیغام بھیجا:

جواہر لال نہرو کے مطابق:

> ''آنے والے انقلاب کیلئے ملک کو تیار کرنا اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلوں کو حل کیجئے، ان کو راستہ بتائیے لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ ہونی چاہئے نہ کہ منطق کے ذریعہ۔ آپ کی بات ان کے دل میں اتر جانی چاہئے۔ ہندوستان میں ادیبوں نے بڑا اثر کیا ہے مثلاً بنگال میں ٹیگور نے لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے، جو ملک کو زیادہ آگے لے جاسکیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام

ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس سے ہمیں بڑی امیدیں ہیں۔"(۱)

ٹیگور کا یہ پیغام کہ:

"یادرکھو تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے "انا" کی کینچلی اتاردو، کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکل کر منزل طے کرو، پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے، روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔"(۲)

اس کے بعد دہلی اور ہری پورہ میں بھی اجلاس ہوئے، دہلی میں منعقد ہونے والے جلسے میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، سومندرا ناتھ ٹیگور، اندولال یا جنک اور فیض احمد فیض وغیرہ نے شرکت کی۔ ہری پورہ کے اجلاس کی صدارت اور ترقی پسند ادب کی حمایت سروجنی نائیڈو نے کی۔

انجمن کی دوسری کل ہند کنفرنس دسمبر ۱۹۳۸ء کے آخری ہفتہ میں کلکتہ میں ہوئی۔ کانفرنس کی افتتاح کیلئے صدارت رابندر ناتھ ٹیگور کا نام تجویز کیا گیا مگر علالت کی وجہ سے وہ کانفرنس میں نہ آسکے لیکن اپنا پیغام ضرور بھیج دیا ان کا خطبہ پڑھ کر سنایا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر ملک راج آنند نے کانفرنس کی صدارت کی۔ اس میں بنگال کے اہم ادیب و شاعر آئے، جن میں شاعر مانک بنرجی، تاراشنکر بنرجی، بدھادیو بوس، پرماتما چودھری، جے این سین، گپتا اور مدھیندر ناتھ دت خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر عبدالعلیم، کرشن چند، مجاز اور سردار جعفری نے اردو کی نمائندگی کی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے اردو ہندی، ہندوستانی کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ مختلف زبانوں کے رجحانات پر تقریریں ہوئیں۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم کو کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ۵ ویں کل ہند کانفرنس بھمیڑی میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں ترقی پسندوں میں انتشار رونما ہوا شاید اسی لئے یہاں پرانے منشور کو ناکافی سمجھ کر اس میں تبدیلیاں کی گئیں اور کھل کر اشتراکیت اور روس کی حمایت کی گئی۔ کیفی اعظمی نے خود نئے منشور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

---

(۱) نیا ادب جنوری۔فروری ۱۹۴۱ء

(۲) نیا ادب جنوری۔فروری ۱۹۴۱ء

''دراصل اس منشور سے ترقی پسند تحریک کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ پندرہ سال کے تجربے کے بعد ہمارے ادیبوں نے وہ راستہ پالیا، جس کی مدتوں سے تلاش تھی۔ اس مینی فیسٹو نے ادب میں رجعت پسندی کے دروازے بند کردئے۔''(۱)

اس کانفرنس کے بعد ادیبوں اور شاعروں کا احتساب ہوگیا۔ چنانچہ ۶ ویں کل ہند کانفرنس مارچ ۱۹۵۳ء میں دہلی میں ہوئی، جس میں ایک بار پھر منشور پر نظر ثانی ہوئی اور اس میں مختلف ترمیم کرکے اسے اور اعتدال پسند بنایا گیا۔ کرشن چندکو کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ مگر کرشن چندکو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ترقی پسندوں سے بدگمانی کی روش اور تیز ہوگئی۔ کرشن چند نے خود ہی تنظیم میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ بقول ڈاکٹر عبدالرحمٰن اعظمی:

''دست صبا'' کی مقبولیت کے بعد اب شاہراہ گروپ کے شعراء بین الاقوامی اور عالمی مسائل کی نظمیں چھوڑ کر غزل گوئی کی طرف لوٹ آئے۔ ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں نے اب ''سرخ سویرا'' اور ''نیلا پرچم'' کے لفظوں سے متاثر ہوکر ترقی پسندی کی سند دینا چھوڑ دیا۔ بلکہ اب کھلے جلسوں میں نعرے بازی کی مذمت کی جانے لگی۔''(۲)

چونکہ ترقی پسندوں میں انتشار پیدا ہو چکا تھا، بہت سی شاخیں ٹوٹ گئی تھیں، جہاں قائم تھیں بس یونہی چلتی رہیں، جس سے ترقی پسند ادب کا رجحان دبتا چلا گیا لیکن پھر بھی بقول منظر اعظمی:

''ترقی پسند مصنفین سے انتہا پسندی کی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں مگر پھر بھی انہوں نے ۱۹۳۵ء سے لیکر ۱۹۶۰ء کی ربع صدی میں اردو کی مختلف اصناف میں جو قابل قدر اضافے کئے اور اردو شعر و ادب کو وسعت اور ہمہ گیری بخش کر جو ذخیرہ فراہم کیا اس سے انکار کرنا ناانصافی ہوگی۔''(۳)

---

(۱) شاہراہ شمارہ نمبر ۴۰۳، ۱۹۴۹ء۔
(۲) اردو میں ترقی پسند تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۱۴
(۳) اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ'' ڈاکٹر منظر اعظمی اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۶ء ص ۴۱۴

کیفی اعظمی کی شاعری کا زمانہ ترقی پسند شاعری کا عہد ہے، انہوں نے جس وقت شاعری شروع کی اس وقت اردو شاعری میں رومانی رجحان دھیرے دھیرے اپنی واضح شکل اختیار کر رہا تھا۔ یہ رومانی رجحان اردو ادب میں مغربی ادب کے راستے آیا، یہ حقیقت ہے کہ اردو میں رومانیت کی کبھی کوئی باقاعدہ تحریک نہیں رہی لیکن اس زمانے میں رومانیت کی بڑھتی ہوئی للک کسی تحریک سے کم بھی نہیں تھی، اس رومانیت کے علمبرداروں میں اختر شیرانی، عظمت اللہ خاں، جوش اور حفیظ جالندھری کے نام آتے ہیں ان ہی کے زیر اثر کم وبیش تمام ترقی پسند شعراء کے یہاں بھی رومانی رجحانات کا اظہار ملتا ہے چنانچہ فیض، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، غلام ربانی تاباں وغیرہ کے یہاں شاعری کے ابتدائی دور میں رومانی شاعری کی گونج سنائی دیتی ہے کیفی کی ابتدائی رومانی شاعری میں اپنے عہد کے یہی اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ابتداء میں ان کے یہاں رومانی عناصر عشقیہ موضوعات تک محدود رہے لیکن آگے چل کر اس میں وسعت اور تنوع پیدا ہوگیا، بانسری کا لہرا، شام، کہرے کا کھیت، منتیں، شباب، پہلا سلام، تجدید، نغمگی، تم اور ملاقات وغیرہ نظموں میں کیفی کے عالم شباب کے جذبات واحساسات کارفرما ہیں ان نظموں میں ندرت بھی ہے اور جمالیاتی کیف ونشاط بھی کیفی کی ابتدائی شاعری کے بارے میں نامی انصاری لکھتے ہیں:

> ''ان کی ابتدائی غنائیہ نظمیں نوجوانی کے عاشقانہ اور رومانی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں، اس دور کی نظموں میں جذبے کی صداقت اور گرمی پوری طرح موجود ہے، نوجوانی کے یہ جذبات ہر دور میں مشترک ہوتے ہیں اور ایک عالم گیر صداقت رکھتے ہیں، اس لئے ان کو صرف سطحی رومانیت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''(۱)

کیفی کی رومانیت کا خاص وصف یہ ہے کہ یہ حقیقت کا سامنا کرکے خارجی حقیقتوں کا اثر قبول کرتی ہے اس کے ساتھ ہی وہ اپنے عہد کی سیاسی کشمکش اور سماجی مسائل سے ہم آہنگ بھی ہوجاتی ہے، عشقیہ اور رومانی موضوعات کے علاوہ کیفی نے اپنے عہد کی جس تحریک کا اثر قبول کیا، وہ ترقی پسند تحریک ہے، ترقی

---

(۱) ''آخرِ شب کا ہم سفر'' کیفی اعظمی فن اور شخصیت۔ شاہد ماہلی ص ۳۶۴ معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۰۰۴ء۔

پسند تحریک بیسویں صدی کے روسی انقلاب اور مارکس کے جدلیاتی مادیت کے فلسفے پر استوار ہے۔

ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں کل کی تخلیق کو آج کے معیار پر پرکھنا صحیح نہیں ہوسکتا۔ آج کی شاعری پرکھنے کیلئے اگر کل کے اصول غلط ہیں تو کل کی شاعری پرکھنے کیلئے آج کے معیار بھی مناسب نہیں ٹھہرتے۔ کیفی کی اگر ابتدائی شاعری میں جوش اور انیس کا پرتو جھلکتا ہے تو اخیر عمر میں ان کے یہاں اقبال کا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے، تو کہیں جوش کا، دراصل رنگ کسی کو بڑا یا اہم نہیں بناتا، جب تک خود اس کا اپنا لب ولہجہ اور اپنی آواز نہ ہو۔ کیفی کی اپنی آواز اور لب ولہجہ ہے ترقی پسند تحریک کے قیام سے اردو ادب میں سماجی حقیقت نگاری کے دور کا آغاز ہوا۔ عوامی زندگی اور اس کے مسائل پیش کر کے ان کا مناسب حل تلاش کرنا اس تحریک کا اولین مقصد رہا ہے۔

۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب آیا، جس میں سرمایہ داری کے خلاف محنت کش طبقوں نے آواز بلند کی اور اشتراکی تحریک وجود میں آئی۔ یہ تحریک سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے اور محنت کشوں کو ان کے حقوق دلانے کیلئے سرگرم عمل ہوئی۔ یہ تحریک ساری دنیا میں تیزی سے پھیلنے لگی کیونکہ اس وقت دنیا کے تمام ادیب اور شاعر مارکس کے جدلیاتی نظریے سے متاثر ہوئے، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں جب دنیا بھر کے ادیبوں کی بین الاقوامی کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی، اس میں ہندوستانی ادیبوں جیسے سجاد ظہیر اور ملک راج آنند وغیرہ بھی شریک تھے، لندن میں ۱۹۳۵ء میں ہی ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ شائع ہوا۔ ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی اس طرح باقاعدہ طور پر ہندوستان میں تحریک کی بنیاد پڑی اور یہ تحریک اردو ادب میں ایک نئی زندگی کا پیغام لیکر آئی۔ کیفی پر ترقی پسند تحریک کا گہرا اثر تھا اور وہ مارکسزم سے بھی بہت زیادہ متاثر تھے۔

بقول زرینہ ثانی:

> ''کیفی کی شاعری پر مارکسزم کے اثرات نظر آتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک سے وابستگی سے اس کے بنیادی اصول شخصیت پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔''(۱)

---

(۱) کیفی اعظمی شخصیت وفن زرینہ ثانی۔ کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۲ء۔

آزادی کے آس پاس کی ترقی پسند شاعری عصری تقاضوں اور نعرے بازی کے ساتھ وقتی اور ہنگامی موضوعات کی شاعری تھی اس عہد میں کیفی نے اپنے شعری مرتبے سے کچھ نیچے اتر کر کوریا کا نعرہ، مژدہ، فتح برلن، قومی حکمراں، وغیرہ نظمیں لکھیں اس دور کی کیفی کی شاعری اپنے عہد سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے کے بعد ہندوستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، چھٹے دہے کے شروع ہوتے ہوئے ہمارے سماج میں کافی تبدیلیاں آئیں اس دور میں کمیونسٹ پارٹی کو بھی ایک بحرانی دور سے گزرنا پڑا۔ ان نئے خیالات نے ادبی تقاضوں کو بھی بڑا متاثر کیا، جس سے ترقی پسند تحریک کی مقبولیت کم ہوتی چلی گئی اور ادبی دنیا میں ایک نئی ہلچل پیدا ہوگئی۔ زیادہ ترقی پسند شاعر احتجاجی شاعری چھوڑ کر نئی حسیت اور راست شاعری پر زور دینے لگے، کیفی ان تمام حالات کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کر رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ایک وقفہ کے بعد اپنی شاعری کو وقتی مسائل اور نعرہ بازی سے پاک کرنے کی کوشش کی کیونکہ ہر ادیب وشاعر اپنے عہد اور ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے، خود کیفی اعظمی کا کہنا ہے کہ:

> ''انسان ہمیشہ اپنے ماحول اور ماحول کے ساتھ اپنے آپ کو بدلتے رہنے کی کوشش کرتا رہا ہے، میری شاعری کا موضوع یہی عظیم جدو جہد ہے۔''(۱)

غرضکہ کیفی بھی اپنے عہد سے متاثر ہو کر پارٹی لائین تک محدود نہیں رہے۔ ۱۹۶۲ء میں کمیونسٹ اکائی ٹوٹنے سے ان کی عقیدت مندی مجروح ہوئی لیکن اشتراکیت اور کمیونزم پر ان کا ایمان آج بھی قائم ہے۔ آوارہ سجدے میں شامل نظمیں ابن مریم، گر بھ وتی، پیر تسمہ پا، چراغاں، عادت، دائرہ، طوفان، دھماکہ اور بنگلہ دیش وغیرہ میں عصری حسیت کی گہری چھاپ ملتی ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ فن کار سماج کا متحرک رکن ہوتا ہے اور اپنے نازک احساسات کے ذریعے اپنے گردو پیش کے ماحول اور اپنے عہد سے گہرے طور پر متاثر ہوتا ہے، جس میں شعوری اور لاشعوری دونوں عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

---

(۱) دیباچہ آوارہ سجدے۔ کیفی اعظمی۔ کلیات کیفی اعظمی۔ کیفیات ص ۲۷۰، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۳ء

باب سوم

کیفی اعظمی کی نظم گوئی

نظم اردو شاعری کی ایک ایسی صنف ہے، جس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں نہ کسی مخصوص ہیئت وساخت کی پابندی ہوتی ہے نہ کسی خاص موضوع کی۔ وحدت خیال اور تسلسل بیان کی صفات ہی اس کی لازمی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر اس شعری پیکر کو ''نظم'' کا نام دیا جا سکتا ہے، جس میں کسی ایک خیال کو مربوط ومنظم طور پر تسلسل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہو۔ بقول سید احتشام حسین:

''...... جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کیلئے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اشعار کا ایسا مجموعہ، جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس ہو۔ اس کیلئے کسی خاص موضوع کی قید نہیں اور نہ اس کی ہیئت ہی معین ہے۔''(۱)

اردو میں جدید نظم نگاری کا آغاز ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے اس مشاعرے سے ہوا، جس سے جدید اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ اب شاعر اپنی نظمیں مصرعہ طرح کے بجائے عنوان کے تحت قلمبند کرتے تھے کیونکہ اب یہ حالات کا تقاضا تھا اور ادیب کا فریضہ بھی۔ حالانکہ ایسی شعری تخلیقات کے نمونے نظیر اکبر آبادی کے یہاں اولاً مل جاتے ہیں۔ اسی لئے مجنوں گورکھپوری نے نظیر کو اردو کا پہلا نظم نگار قرار دیا ہے اس سلسلے میں ان کا یہ کہنا کہ:

''اگر قصائد اور مثنویات کو نظم میں شمار نہ کیا جائے اور نظم کی اصلاح کو جدید معنوں میں استعمال کیا جائے تو نظیر اردو کے پہلے نظم نگار ہیں۔''(۲)

---

(۱) اردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقاء۔ سید احتشام حسین (اصناف سخن نمبر) نگار لکھنؤ جنوری۔ فروری ۱۹۵۷ء ص ۱۲۹

(۲) مجنوں گورکھپوری نقوش وافکار مطبوعہ ۱۹۵۵ء مشمولہ مضمون نظیر اکبر آبادی اور اردو شاعری میں واقعیت وجمہوریت کا ظہور ص ۲۳۷

ہندوستان میں ۱۹ویں صدی میں جدوجہد آزادی کا باقاعدہ آغاز ہوا لیکن ۲۰ویں صدی میں جس جدوجہد نے کافی زور پکڑا اور پھر یہ ۱۹۴۷ء تک پوری شدومد کے ساتھ جاری رہا۔ اس عہد میں اہل ہند کی تمام تر توجہ اسی جدوجہد آزادی کی طرف مرکوز رہی۔ اردو نظم نگاری نے بھی خود کو اس کیلئے وقف کر دیا اس نے اسی جدوجہد کے پودے کو اپنے خون جگر سے سینچا۔ بقول جاں نثار اختر:

''یہ حقیقت ہے کہ جنگ آزادی کی تاریخ کو اردو نظموں نے اپنے خون دل سے لکھا ہے اور اسے دوست دشمن سب مانتے ہیں۔''(۱)

اسی زمانے میں اردو نظم نگاری کی دنیا میں بعض ایسے شعراء بھی ابھرے، جنہوں نے کسی ایک مذہب کو اپنی شعری فکر کا مرکز بنایا۔ لیکن اس قسم کے شاعروں کی نظموں میں سیکولر جذبات اور قومی یکجہتی کے عناصر کی تاب و توانائی سموئی ہے۔ ان شاعروں میں سب سے عظیم نام اقبال کا ہے۔ ۱۹۰۵ء تک ان کی شاعری پر وطنیت کا جذبہ پوری طرح چھایا رہا۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے وطنیت کے بجائے اسلام اور اس کے پیغامات ان کی شعری فکر کا اساس بن گیا۔ اقبال نے اپنی شاعری میں کبھی علاحدگی پسندی کی تبلیغ نہیں کی۔ ان کا سارا کلام اس رجحان سے پاک ہے۔ بقول ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی:

''ان کی شاعری کا کوئی دور بھی ہو، ایک مصرعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ علاحدگی پسند رجحان رکھتے تھے یا کبھی انہوں نے ایک مصرعہ بھی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف لکھا ہو۔''(۲)

سماجی کش مکش سے پیدا ہونے والے ادب کا جتنا ذخیرہ اردو میں فراہم کیا گیا ہے اتنا شاید ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں۔ اگر صرف ایسے شاعروں کا ذکر کیا جائے، جو انقلاب کی دھمک اپنے سینے میں محسوس کر رہے تو ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے اگرچہ ان میں اکثر انقلاب کے اصلی تاریخی مفہوم سے واقف نہیں لیکن موجودہ نظام کی خرابیوں سے بہت نالاں ہیں اور اسے بدلتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جوش،

(۱) ہندوستان ہمارا جاں نثار اختر جلد اول مطبوعہ جون ۱۹۷۳ء ص ۲۷۔

(۲) اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر۔ ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی طبع اول ۱۹۷۵ء ص ۳۴۲

مجاز، سردار جعفری، سلام مچھلی شہری، علی جواد زیدی، اختر شیرانی، جذبی، شمیم کرہانی، جاں نثار اختر، ن م راشد، مخدوم، فیض اور کیفی اعظمی یہ صرف چند نام ہیں جو جدید اردو شاعری کا ذکر کرتے وقت نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ ان میں اکثر شعراء اس احساس سے سرشار ہیں کہ ان کی شاعری کو زندگی کی کش مکش کا ساتھ دینا ہے۔ پوری سماجی ذمہ داری سے اس کا حل ڈھونڈنا ہے اور اپنی شاعری کو تمدن کی بہترین قدروں اور روایتوں کا حصہ بنانا ہے۔ ان لوگوں نے شاعری کو سماجی زندگی کے اظہار کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔

کیفی اعظمی کا زمانہ ادبی لحاظ سے وہ دور تھا، جب ادب اردو میں روایت سے بغاوت اور فکری تبدیلیوں کا زور تھا۔ اس وقت اردو شاعری اختر شیرانی، جاں نثار اختر، جوش ملیح آبادی کے زمزموں سے گونج رہی تھی، یہ درست ہے کہ اردو شاعری میں رومانیت کی باقاعدہ کوئی تحریک کبھی نہیں رہی لیکن یہ وقت کا تقاضا تھا کہ اس زمانے میں رومانیت کی بڑھتی ہوئی للک (شوق) کسی تحریک سے کم بھی نہیں تھی۔ اس لحاظ سے ہم کیفی اعظمی کے اس عہد کو اگر رومانی شاعری کا دور کہہ لیں تو غلط نہ ہوگا۔ کیفی اعظمی اس بدلتے ہوئے رجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور رومانیت میں شرابور نظموں اور غزلوں سے اپنی شعر گوئی کی شروعات کی۔ ان کے پہلے مجموعہ ''جھنکار'' کی نظمیں اردو شاعری کا بہترین حصہ کہی جا سکتی ہیں۔ اسی پرتو سے ان کی اس انداز کی شاعری نہایت سبک نرم شگفتہ مترنم اور نغمگی سے بھرپور ہے، جس میں جذبے کی صداقت کے ساتھ اثر پذیری بھی ہے اسی سلسلے میں مظفر حنفی لکھتے ہیں:

> ''کیفی اعظمی کی دور اول کی نظمیں رومانی تخلیقات ہیں، ان میں عنفوان شباب کے جذبات و احساسات کارفرما ہیں اور جمالیاتی کیف و نشاط کے ساتھ ندرت ادا بھی ان نظموں کا امتیازی وصف ہے۔''(۱)

کیفی اعظمی کی رومانی شاعری مشکل پسندی اور ابہام سے پاک ہے اس میں جوش اور تاثیر کے ساتھ سادگی کا عنصر غالب ہے اس کی اہم خوبی اس کی تصویریت ہے، کیفی اپنے جذبات و احساسات کو تصویر کی

---

(۱) جہات و جستجو طبع اول مظفر حنفی ص ۱۱۶ طبع ۱۹۸۲ء۔

طرح کھول کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک بڑی حد تک اس میں ان کو کامیابی بھی ملی ہے۔ ان کی رومانی شاعری میں جوش اور اختر شیرانی کے اثرات کا عکس بھی نظر آتا ہے، کچھ مثالیں ملاحظہ کیجئے:

نظم ''برسات کی ایک رات'' سے:

یہ برسات یہ موسم شادمانی
خس وخار پر پھٹ پڑی ہے جوانی
بھڑکتا ہے رہ رہ کے سوز محبت
جھماجھم برستا ہے پرشور پانی
فضا جھومتی ہے گھٹا جھومتی ہے
درختوں کو ضو برق کی چومتی ہے
تھرکتے ہوئے ابر کا جذب توبہ
کہ دامن اٹھائے زمیں گھومتی ہے

اور یہ اشعار:

فلک گارہا ہے زمیں گارہی ہے
کلیجے میں ہر لے چبھی جارہی ہے
مجھے پا کے اس مست شب میں اکیلا
یہ رنگیں گھٹا تیر برسارہی ہے
بھلا لطف کیا منظرِ پُر اثر دے
کہ اشکوں نے آنکھوں پہ ڈالے ہیں پردے
کہیں اور جاکر برس مست بادل
خدا تیرا دامن جواہر سے بھردے

نظم ''شام'' سے ماخوذ

مست گھٹا منڈلائی ہوئی ہے
باغ پہ مستی چھائی ہوئی ہے
جھوم رہی ہیں آم کی شاخیں
نیند سی جیسے آئی ہوئی ہے
بولتا ہے رہ رہ کے پپیہا
برق سی اک لہرائی ہوئی ہے
رینگتے ہیں خاموش ترانے
موج ہوا بل کھائی ہوئی ہے
نہ پوچھو وہ کس طرح آ کر سدھاری
مری ساری ہستی پہ چھا کر سدھاری
وہ پچھلا پہر وہ جدائی کا لمحہ
سویرے سویرے رُلا کر سدھاری

......☆☆☆......

وہ پلکوں کی مستی وہ نظروں کی مستی
انہیں مستیوں میں نہا کر سدھاری
تھکی سی وہ انگڑائیاں وہ جماہی
سنبھل کر اٹھی لڑکھڑا کر سدھاری
خراماں خراماں، پشیماں پشیماں
خود اپنے سے بھی چھپ چھپا کر سدھاری

نکل جائے جس طرح غنچے سے خوشبو
یونہی میرا پہلو بسا کر سدھاری

(نظم ''سویرے سویرے'' سے ماخوذ)

اور نظم ''آندھی'' سے یہ بند ملاحظہ ہو:

مچلتی جھومتی ہلچل مچاتی
تڑپتی شور کرتی دل ہلاتی
گرجتی چیختی فتنے اٹھاتی
قیامت کو جگا کر لا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے
نشانات ستم تھرا رہے ہیں
حکومت کے علم تھرا رہے ہیں
غلامی کے قدم تھرا رہے ہیں
غلامی اب وطن سے جا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھ آ رہی ہے

(نظم ''آندھی'')

جھنکار کی کچھ نظموں مثلاً ''آوارہ نغمہ''، ''بانسری کا لہرا''، ''کہرے کا کھیت''، ''پیتل کے کنگن''، ''مشورے''، ''دھواں''، ''آواز کی شکست''، ''تصادم'' اور ''دوشیزہ مالن'' میں مناظر فطرت گاؤں کی زندگی اور اس کے ماحول جنگلوں اور موسموں کے ساتھ دیہی مناظر کی اچھی تصویر کشی رومانی انداز میں کی گئی ہے۔ دوشیزہ مالن کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

وہ شام تھی کتنی مست و بیخود جو مجھ کو بیخود بنا رہی تھی
اک آگ دل کی بجھا رہی تھی اک اگ دل میں لگا رہی تھی

نفس میں حل ہو رہی تھیں پیہم ہوا کی پر کیف و نرم لہریں
فضا کی مستی سمٹ سمٹ کر دل ونظر میں سما رہی تھیں
دھواں دھواں تھا شفق سا چہرہ بجھی بجھی تھیں سنہری کرنیں
ہر ایک شے میں تھی بیخودی سی ہر ایک شے سوئی جا رہی تھی
دھنک کی رنگین دھاریوں پر بھی ڈال دی تھی گھٹا نے چادر
گھٹا کی چادر میں بھی مچلتی ہوئی دھنک جگمگا رہی تھی
وہ بانسری کی لطیف لہریں لطیف لہروں میں اس کے نغمے
زمانہ مسحور ہو رہا تھا خدائی ہچکولے کھا رہی تھی!
نگاہ نغمہ، خرام نغمہ، کلام نغمہ، پیام نغمہ
ہوا میں نغمے سمو رہی تھی فضا میں نغمے گھلا رہی تھی

(نظم ''آوارہ نغمہ سے'')

کسی نے بانسری بھی لو بجا دی
ارے کوئی قیامت ڈھا رہا ہے
سکوت شب کا خواب آور فسانہ
سروں میں جذب ہوتا جا رہا ہے
سمٹتا ہے سکڑتا ہے اجالا
مہ و انجم کو غش سا آ رہا ہے
زمیں محور پہ گھومی جا رہی ہے
فلک مرکز پہ جھوما جا رہا ہے

(نظم ''بانسری کا لہرا'')

قبضہ سے تیرگی کے سحر چھوٹنے کو تھی
مشرق کے حاشیے میں کرن پھوٹنے کو تھی
کہرے میں تھا ڈھکے ہوئے باغوں کا یہ سماں
جس طرح زیر آب جھلکی ہوں بستیاں
بھیگی ہوئی زمیں تھی نمی سی فضا میں تھی
اک کشت برف تھی کہ معلق ہوا میں تھی
جادو کے فرش سحر کے سب شقف وبام تھے
دوش ہوا پہ پریوں کے سیمیں خیام تھے

(نظم ''کہرے کا کھیت'')

جب سے میرے گھر میں تو آئی ہے اے مفلس نواز
بن گئی ہے ساری ہستی پیکر سوز وگداز
نوجواں دل میں سنانیں رنج کی گڑنے لگیں
آہ قبل از وقت رخ پر جھریاں پڑنے لگیں
وہ گلابی انکھڑیاں وہ رس میں ڈوبے لب نہیں
میں نے جو گھونگھٹ میں دیکھے تھے وہ تیور اب نہیں
ملطع شادی پر غربت کی اداسی چھا گئی
حیف وہ گھر جس میں آ کر خود شمع سنولا گئی

(نظم ''پیتل کے کنگن'')

یہ آندھی، یہ طوفان، یہ تیز دھارے
کڑکتے تماشے، گرجتے نظارے

اندھیری فضا سانس لیتا سمندر
نہ ہمراہ مشعل، نہ گردوں پہ تارے
مسافر! کھڑا رہ ابھی جو کو مارے

(نظم ''مشورے'')

یہ سیہ فام چمنی سے اٹھتا دھواں
کارخانے کا ڈھالا ہوا آسماں
ابر کی طرح گردوں کے لب چومتا
اژدہے کی طرح انبارتا جھومتا
لوں کی مانند دامن جھٹکتا ہوا
زہر ملکر فضا میں جھٹکتا ہوا
بجلیاں آستیں میں سنبھالے ہوئے
بوجھ سا دوش ہستی پہ ڈالے ہوئے
دامن تار پر جا بجا نقش گیر
خون مزدور کی آری ترچھی لکیر

(نظم ''دھواں'')

یہ تاریک جادہ، یہ پرہول جنگل
چلائی ہے غول بیاناں نے مشعل
درختوں کے نیچے ہے وحشت کا ڈیرا
ہواؤں میں حل ہورہا ہے اندھیرا
اندھیرے میں احساس یہ بھی نہیں ہے
زمیں پر فلک یا فلک پر زمیں ہے

بھیانک خموشی کے اللہ رے تیور
کہ بجتے ہیں کان آپ اپنی صدا پر

(نظم ''آواز کی شکست'')

دو نگاہوں کا اچانک وہ تصادم مت پوچھ
ٹھیس لگتے ہی اڑا نشق تزارہ بن کر
اڑ کے پہلے انہیں جھینپی ہوئی نظروں میں رکا
نرم معصوم، حسیں، مست اشارہ بن کر
پھر نگہ سے عرق آلود جبیں پر جھلکا
پنکھڑی، پھول، گہر، لال ستارہ بن کر
ڈھلکتے ماتھے سے اتر آیا گل عارض میں
رنگ رس، شہد نہیں ان سے بھی پیارا بن کر
بس کے بانہوں کی گدازی میں چلا دل کی طرف
چاہ الطاف، کرم، پیار مدارا بن کر
دل میں ڈوبا تھا کہ بس پھوٹ پڑا رگ رگ سے
جانِ دل، جانِ نظر، جانِ نظارہ بن کر
آتے ہی چھا گیا کھوئی ہوئی ہستی میں مری
میری کھوئی ہوئی ہستی کا سہارا بن کر
اب شرارہ وہی اس کے لب ورخسار میں ہے
اور کیفی میرے تپتے ہوئے اشعار میں ہے

(نظم ''تصادم'')

پھولی شفق فضا میں حنا تلملا گئی
اک موج رنگ کانپ کے عالم پہ چھا گئی
کل چاندنی سمٹ کے گلوں میں سما گئی
ذرے بنے نجوم زمیں جگمگا گئی
چھوڑا سحر نے تیرگی شب کو کاٹ کے
اڑنے لگی ہوا میں کرن اوس چاٹ کے
مچلی جبیں، شرق پہ اس طرح موج نور
لہرا کے تیرنے لگی عالم میں برق طور
اڑنے لگی شیم چھلکنے لگا سرور
کھلنے لگے شگوفے چہکنے لگے طیور
جھونکے چلے ہوا کے شجر جھومنے لگے
مستی میں پھول کانٹوں کا منہ چومنے لگے

(نظم ''دوشیزہ مالن'')

لو پو پھٹی وہ چھپ گئی تاروں کی انجمن
لو جام مہر سے وہ چھلکنے لگی کرن
چھوڑا سحر نے تیرگی شب کو کاٹ کے
اڑنے لگی ہوا میں کرن اوس چاٹ کے
جھونکے چلے ہوا کے شجر جھومنے لگے
مستی میں پھول کانٹوں کا منہ چومنے لگے
تھم تھم کے ضوفشاں ہوا ذروں پہ آفتاب
چھڑکا ہوا نے سبزہ خوابیدہ پر گلاب

رندان مست اور بھی سرمست ہو گئے

تھرا کے ہونٹ جام میں پیوست ہو گئے

دوشیزہ ایک خوش قد وخوشرنگ و خوبرو

مالن کی نور دیدہ گلستاں کی آبرو

مہکا رہی ہے پھولوں سے دامان آرزو

طفلی لئے ہے گود میں طوفانِ رنگ وبو

فطرت نے تول تول کے چشم قبول میں

سارا چمن نچوڑ دیا ایک پھول میں

ان سبھی اشعار میں نہایت خوبصورت مرقع حسن اور بیانیہ رومانی شاعری کی ساری خوبیاں سمٹ آئی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی اس وقت کیفی کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد کیفی ذہنی طور پر یعنی ۱۹۴۳ء سے باقاعدہ عملی طور پر ترقی پسند تحریک سے جڑ گئے، پھر بھی ۱۹۴۵ء تک ان کا رجحان شاعری زیادہ تر رومانی شاعری کی طرف ہی رہا۔ مجموعہ نظم ''آخرشب'' کی زیادہ تر نظمیں رومانی شاعری کی بہترین مثالیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان میں ''تجدید''، ''حوصلہ''، ''تبسم''، ''نرسوں کی محافظ''، ''نغمگی''، ''تم''، ''تصور''، ''ملاقات''، ''پشیمانی''، ''مجبوری''، ''نقش ونگار''، ''احتیاط'' وغیرہ رومانی شاعری کی بہترین مثالیں ہیں، ملاحظہ کیجئے:

کسی نے آج اک انگڑائی لے کر

نظر میں ریشمی گرہیں لگا دیں

تلاطم ولولے ہیجان ارماں

وہی چنگاریاں پھر مسکرا دیں

(نظم ''تجدید'')

اک کلی نور دیدۂ گلزار
گوہر شب چراغ باغ وبہار
نرم، نازک، شگفتہ، لالہ گوں
شوخ، معصوم، بے زباں طرار
مجھ پہ رنگینیاں لٹاتی تھی
لطف نظارگی مٹاہی دیا
میں نے دست طلب بڑھاہی دیا
پنکھڑی میں نہاں تھی چنگاری
ہاتھ جس نے مرا جلاہی دیا
اور کلی مجھ پر مسکراتی تھی

(نظم ''تبسم'')

آواز تری جس طرح جگنو چمک جائے کوئی
یا صبح کی آغوش میں غنچہ چٹک جائے کوئی
موجوں کے آئینے میں یا موتی جھلک جائے کوئی
ساغر چھلک جائے کوئی

اے بنت مریم گنگنا
اے جان نغمہ گائے جا

جیسے شگوفوں میں سما کر گنگناتی ہے ہوا
جیسے خلا میں رات کو گھنگھرو بجاتی ہے گھٹا
جیسے کسی دوشیزہ کے دل کے دھڑکنے کی صدا
زندہ رہے نغمہ ترا

اے بنت مریم گنگنا
اے جان نغمہ گائے کا
(نظم "نغمگی")

شگفتگی کا، لطافت کا شاہکار ہو تم
فقط بہار نہیں حاصل بہار ہو تم
جو ایک پھول میں ہے قید وہ گلستاں ہو
جو اک کلی میں ہے پنہاں وہ لالہ زار ہو تم
حلاوتوں کی تمنا، ملاحتوں کی مراد
غرور کلیوں کا، پھولوں کا انکسار ہو تم
جسے ترنگ میں فطرت نے گنگنایا ہے
وہ بھیرویں ہو، وہ دیپک ہو وہ ملہار ہو تم
تمہارے جسم میں خوابیدہ ہیں ہزاروں راگ
نگاہ چھیڑتی ہے جس کو وہ ستار ہو تم
جسے اٹھا نہ سکی جستجو وہ موتی ہو
جسے نہ گوندھ سکی آرزو وہ ہار ہو تم
جسے نہ بوجھ سکا عشق وہ پہیلی ہو
جسے سمجھ نہ سکا پیار بھی وہ پیار ہو تم
خدا کرے کسی دامن میں جذب ہو نہ سکیں
یہ میرے اشک حسیں جن سے آشکار ہو تم

(نظم "تم")

یہ جسم نازک، یہ نرم بانہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو

ہزاروں جادو جگا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

گلابی لب، مسکراتے عارض، جبیں کشادہ، بلند قامت
نگاہ میں بجلیوں کی جھلمل، اداؤں میں شبنمی لطافت
دھڑکتا سینہ، مہکتی سانسیں، نوا میں رس، انکھڑیوں میں امرت
ہمہ حلاوت، ہمہ ملاحت، ہمہ ترنم، ہمہ نزاکت

لچک لچک گنگنا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

(نظم ''تصور'')

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منالے گی مجھ کو
مگر اس نے روکا نہ مجھ کو منایا
مرا دامن ہی پکڑا نہ مجھ کو بٹھایا
نہ آواز ہی دی نہ مجھ کو بلایا
میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جدا ہوگیا ہوں

(نظم ''پشیمانی'')

مجھ سے شان جلوہ فرمائی نہ پوچھ
کس طرح وہ سامنے آئی نہ پوچھ
اس کا حسن اور اس کی رعنائی نہ پوچھ
وہ حجاب آلود انگڑائی نہ پوچھ
دل نہ قدموں پر لٹاتا کس طرح

وہ تبسم، وہ ترنم، وہ شباب
وہ نگاہیں وہ ادائیں، وہ حجاب
اس کے عارض میں لہکتا ہے گلاب
اس کی آنکھوں سے برستی ہے شراب
پی کے بے خود ہو نہ جاتا کس طرح

(نظم ''مجبوری'')

تو مجسم جمال کی دنیا
تو مجسم کمال کا بازار
تو مکمل فسانۂ گلشن
تو مکمل حدیث باغ وبہار
تو سراپا کمال حسن وشباب
تو سراپا طلسم نقش ونگار
تو نزاکت کی اولیں پہچان
تو لطافت کا آخری معیار

(نظم ''نقش ونگار'')

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
مجھ سے بکھرے ہوئے گیسو نہیں دیکھے جاتے
سرخ آنکھوں کی قسم کانپتی پلکوں کی قسم
تھرتھراتے ہوئے آنسو نہیں دیکھے جاتے
اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
میں اس اجڑے ہوئے پہلو میں بٹھالوں نہ کہیں
لبِ شیریں کا نمک عارضِ نمکیں کی مٹھاس
اپنے ترسے ہوئے ہونٹوں میں چرالوں نہ کہیں

(نظم ''احتیاط'')

تو خورشید ہے بادلوں میں نہ چھپ
تو مہتاب ہے جگمگانا نہ چھوڑ
تو شوخی ہے شوخی رعایت نہ کر
تو بجلی ہے بجلی جلانا نہ چھوڑ
ابھی عشق نے ہار مانی نہیں
ابھی عشق کو آزمانا نہ چھوڑ

(نظم ''حوصلہ'')

کلی کا روپ پھول کا نکھار لے کے آئی تھی
وہ آج کل خزانہ بہار لے کے آئی تھی
تمام رات جاگنے کے بعد چشم مست میں
یقیں کا رس امید کا خمار لے کے آئی تھی

بسنتی ساری میں چھپا ہوا سا وہ جواں بدن
جواں بدن پہ ریشمی بہار لے کے آئی تھی
وہ صندلیں کلائیاں وہ سبز و سرخ چوڑیاں
سہاگ لے کے آئی تھی سنگار لے کے آئی تھی
میری اجاڑ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں
وہ گیسوؤں کا ابرِ عطر بار لے کے آئی تھی
اداس اداس زیست کو سنا رہی تھی بانسری
گھٹے گھٹے سکوت میں ستار لے کے آئی تھی

(نظم ''ملاقات'')

کیفی اعظمی کی رومانی نظموں میں اس طرح کی مثالیں کافی تعداد میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ کیفی کی یہ نظمیں ان کی فنی مہارت اور شاعرانہ ہنرمندیوں پر دلالت کرتی ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ رومانی شاعری میں مردوں کے عشق کی قلبی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے لیکن کیفی نے عورتوں کی نفسیات اور ان کے عشقیہ پہلو کو بھی موضوع شعر بنایا ہے اسے ہم ہندی شاعری کا اثر کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ یہ انداز شاعری ہندی شاعری میں عام ہے۔ یہ روش اردو شعراء کے یہاں بہت کم نظر آتی ہے، کیفی کی اس طرح کی نظمیں اندیشے، تصور، نرسوں کی محافظ، احتیاط، منظر خلوت خاص طور سے قابل ذکر ہیں یہ نظمیں معشوق کے جذبات اور ان کی قلبی کیفیات کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ان نظموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پشیمانی''، ''ٹرنک کال''، ''پامسٹ'' ''حوصلہ'' اور ''تبسم'' اسی نوعیت (رومانیت) کی خوبصورت اور ترشی ہوئی نظمیں ہیں، جن میں آج بھی تازگی اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔''(۱)

(۱) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۴۷ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۶ء۔

کیفی کی رومانی نظموں میں غنائیت کی خوبیاں ہیں انہوں نے خاص طور سے اس کو برتنے میں سطحیت سے دامن بچائے رہنے کا لحاظ برقرار رکھا ہے، جو ایک بڑا وصف ان کی رومانی شاعری کا کہا جا سکتا ہے اسی سلسلے میں فیض احمد فیض نے یہ تجزیہ پیش کیا ہے:

''بنیادی طور سے کیفی کی شاعری کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے لیکن غنائیہ شاعری کے سطحی تکلفات اور مصنوعی زیبائشوں سے کیفی نے بہت کم سروکار رکھا ہے۔''(۱)

عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ عشقیہ رومانی شاعری میں جذبات اور احساسات کی آرزومندی کا جو سرمایہ ہوتا ہے وہ کسی فرد واحد کی داخلی یا نجی دنیا کا کاروبار نہیں ہوتا بلکہ اپنے دور کے سبھی انسانوں کے دل کی دھڑکن ہوتی ہے۔ کیفی کی نظموں میں دردمندی و مجبوری کی ایک ایسی فضا موجود ہے، جو تجربوں کی صداقت سے ہی وجود میں آسکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کیفی کی رومانی شاعری اردو کی رومانی شاعری کا ایک خاص حصہ ہے۔ ان کی نظم ''اندیشے'' کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوز محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

...........☆☆...........

دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پئے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا

---

(۱) پیش لفظ ''آوارہ سجدے''، فیض احمد فیض ''کیفیات'' کیفی اعظمی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۳ء ص ۲۶۸۔

عشق ومحبت کی فضا میں کہی گئی یہ خاص رومانی نظم ہے، جس میں دو دلوں کے آپسی لگاؤ کے بعد فراق (الگاؤ) کے درد وکرب کا اظہار نہایت اچھے ڈھنگ سے کیا گیا ہے بقول انور سدید:

''یہ شاعری ہندوستان کے ایک خاکی انسان کی شاعری ہے، اس لئے میں اس مٹی کا جادو اپنا اثر وعمل خوبی اور خوبصورتی سے جگاتا اور شاعر کو افلاطونی بننے سے بچالیتا ہے۔''(۱)

بقول پروفیسر جگناتھ آزاد:

''کیفی کی ابتدائی شاعری رومانیت اور کلاسیکیت کا حسین امتزاج ایک خوبصورت اکائی کی صورت میں نظر آتا ہے۔''(۲)

اسی طرح اصغر علی انجینئر کو بھی کیفی کی شاعری میں اس دور کی کلاسیکی روایت نظر آتی ہے وہ لکھتے ہیں:

''ان نظموں میں ہمیں رومانی شاعری کے بہترین نمونے مل جاتے ہیں اس میں موسیقیت بھی ہے اور رچاؤ بھی رنگینی بھی ہے اور حسن وعشق کی چاشنی بھی غرضکہ فارسی اور اردو کی کلاسیکی روایات اور جمالیاتی عناصر ان کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔''(۳)

ڈاکٹر حامدی کشمیری کیفی کی شاعری میں اختر شیرانی کی رومانیت کی بازگشت محسوس کرتے ہیں، کیونکہ یہ اسی دور کا عام رجحان تھا اس سلسلے میں ش. اختر نے صحیح تجزیہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''کیفی کی رومانی شاعری میں برابر ہی ایک طرح کی رجائیت طاری رہی ہے۔ اگر غموں کی کیفیت بھی ملتی ہے تو حزن معصوم کی شکل میں اختر شیرانی اس حقیقت کے باوجود کہ انہوں نے اردو شاعری میں ایک طرح کی رومانی حقیقت پسندی کی روایت کی

---

(۱) کیفی اعظمی معاملات جہاں کا شاعر انور سدید کیفی اعظمی شخصیت اور شاعری ص ۱۴۲ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء۔
(۲) کیفی اعظمی کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر جگناتھ آزاد۔ کیفی اعظمی شخصیت اور شاعری۔ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء۔
(۳) کیفی اعظمی شخصیت اور شاعری اصغر علی انجینئر۔ ص ۸۸، کیفی اعظمی شخصیت اور شاعری۔ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء۔

توسیع کی کیفی کے مرشد نہیں بن سکے۔''(۱)

بنیادی طور پر کیفی اعظمی رومانی شاعر ہیں لیکن انہوں نے آگے چل کر سماجی اور معاشرتی ذمہ داریوں کا راستہ اختیار کیا اور سماجی اور سیاسی حالات کو اپنا موضوع شاعری بنایا۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ فنکار ادیب وشاعر اپنے معاشرے کا سب سے حساس اور ذمہ دار شخص ہوتا ہے یہی صلاحیت وقوت اسے فنکار یا ادیب وشاعر بنانے کی محرک ہوتی ہے۔ سماجی ذمہ داری کو نبھانا ادیب کا فرض ہے بقول ژاں پال سارتر:

''اگر ادیب لکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنا فرض سنبھال لیا ہے
کہ اس دنیا جہاں آزادی کو ہر دم کھٹکا سا لگا رہتا ہے۔''(۲)

کیفی اعظمی نے ترقی پسند شاعری کی عام روش کو خاطر خواہ طریقے سے اپنایا اور شاعری کی، کیفی کے اس نئے موڑ اور نئے شعور کے عناصر ان کے یہاں ۱۹۴۳ء سے ہی نظر آنے لگتے ہیں، اس ضمن میں اصغر علی انجینئر لکھتے ہیں:

''آخرشب'' میں شامل ان کی نظم منظر خلوت پہلی نظم ہے، (یہ نظم ۱۹۴۳ء میں لکھی گئی تھی) جو کیفی کی شاعری کے نئے موڑ کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس میں ایک بیوہ کی ایک ملا کے ساتھ عصمت دری کا واقعہ نظم کیا گیا ہے اور اس طرح مذہب کے نام پر ایکسپلائٹیشن کی مذمت کی گئی ہے لیکن اس نظم کا آہنگ رومانیت لئے ہوئے ہے اور اس میں ان کی رومانی شاعری کے سارے عناصر موجود ہیں۔''(۳)

منظر خلوت ۳۲ راشعار کی طویل نظم ہے، اس کا قصہ نہایت ملامت خیز اور حیوانیت سے لبریز ہے، ایک بیوہ کسی مولوی سے اپنی غربت اور اپنے معصوم بچے عابد کی زندگی کی خیر کے لئے کسی دعا تعویذ کی خواہش کرتے ہوئے اپنا دکھ بیان کرتی ہے، مولوی صاحب کی رگ شہوانیت میں انسانیت کے بجائے

---

(۱) نوید فتح ہے قلب عوام کی دھڑکن ش. اختر مشمولہ کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ء۔
(۲) ادب کلچر اور مسائل-ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۸ء۔
(۳) کیفی اعظمی شخصیت اور شاعری-اصغر علی انجینئر مشمولہ مضمون ''فن اور شخصیت'' معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء۔

درندگی اور ہوسناکی کا کیوپڑ جوش مارنے لگتا ہے اور وہ اس مجبور و بے سہارا عورت کی آبرو لوٹ لیتے ہیں۔ مولوی کی آگ تو بجھ جاتی ہے لیکن عورت کی آگ بجھتی ہے یا بھڑکتی ہے اس سے انہیں کیا سروکار، نظم کا اختتامیہ نہایت عبرت ناک ہے اور اس دور کے ریاکار مولویوں کا کچا چٹھا۔ اس نظم کا آخری شعر کیفی کے دل کی آواز ہی نہیں ہر سنجیدہ انسان کی آواز ہے، ملاحظہ کیجئے:

تف ہے تجھ پر تف ہے زہدِ سفلہ خو
لوٹ لی اک بے زباں کی آبرو

۱۹۴۵ء سے کیفی کی شاعری پر اشتراکی نظریات اور ترقی پسند رجحانات کی نمایاں چھاپ نظر آتی ہے لیکن مارکسی تعلیمات کے اثرات ان کے یہاں جھنکار کی تخلیقات میں بھی موجود ہیں، نظم ''دستورِ بخشش'' کے یہ اشعار دیکھئے:

لبالب ہیں کہیں ساغر کہیں خالی پیالے ہیں
یہ کیسا دور ہے ساقی یہ کیا تقسیم ہے ساقی
نہیں پہچانتا تیور ابھی تو تشنہ کاموں کے
ترا دستور بخشش لائق ترمیم ہے ساقی

اس کے علاوہ بھی جھنکار کی بہت سے نظمیں رومانی سیاسی شاعری کی اچھی مثالیں ہیں۔ ''آواز کی شکست''، ''جیل کے در پر''، ''آندھی بیکاری''، ''حقیقتیں''، ''بیکار مزدور''، ''گمراہ ولی عہد'' وغیرہ نظموں میں ترقی پسند خیالات کا رومانی انداز میں اظہار کیا گیا ہے۔

نفس سرد ہے نبض زار و حزیں ہے
یہ جینے کی ذلت ہے، جینا نہیں ہے
میں اس زندگی کو مٹا کر رہوں گا!
غلامی کی دیوار ڈھا کر رہوں گا

چڑھاؤں گا پودوں پہ خنجر کا پانی
خس وخار کو بخش دوں گا جوانی
مٹادوں گا بندوں کا زعم خدائی
ارے پھر کدھر یہ آواز آئی

(نظم ''آواز کی شکست'')

اک مجسم جرأت وغیرت سراپا انقلاب
کھارہا تھا جیل کے در پر ہزاروں پیچ وتاب
آنکھ میں خون بغاوت قلب میں حب وطن
آک تیکھی چتونوں میں انکھڑیوں میں بانکپن
تپتی سانسوں میں شرارے جھکولے آندھیاں
تلملاتی تیوریوں میں تھرتھراتی بجلیاں
خود سراپا اپنے ہر محکم ارادے کا ثبوت
ہند کی پونجی وطن کی لاج بھارت کا سپوت
چوٹ سی کھاتا تھا دل پر قیدیوں کو دیکھ کر
بے ارادہ توڑ دیتا تھا سلاخوں کی کمر

............☆☆☆............

عورتیں دنیا کی ہوں مصروف تزئین دوام
اور ہماری عورتوں کا حق کہ وہ ڈھالیں غلام
کچھ خبر ہے رورہی ہے مادر ہندوستاں
ڈگمگاتی ہے زمیں تھرا رہا ہے آسماں

ظلم واستبداد کے چھائے ہیں بادل چار سو
حل کیا جاتا ہے سکوں میں غریبوں کا لہو
بیکسوں کی آہ بھی اہل دول سنتے نہیں
گل کے بندے باغ سے کانٹے کبھی چنتے نہیں
دے رہا ہے دم بدم ہم کو صدا ہندوستاں
بن نہیں سکتی ہیں اب قدموں کا لنگر بیڑیاں
مل نہیں سکتی وطن میں اب غلامی کو پناہ
خاروخس بھی بجلیوں پر گرم کرتے ہیں نگاہ
آستان جبر پر اب جبہ سائی ہوچکی
اہرمن سیرت خداؤں کی خدائی ہوچکی
دفعتاً پیدا ہوا کچھ قیدیوں میں خلفشار
آ گیا بیوی کو اس تپتے ہوئے لہجہ پہ پیار
دوڑ کر ڈالا گلے میں ہار پھر شرما گئی
مادر ہندوستاں کے رخ پر سرخی چھا گئی

(نظم ''جیل کے در پر'')

یہ باز یہ بازو کی میرے صلابت
یہ سینہ، یہ گردن، یہ قوت، یہ طاقت
یہ جوش جوانی یہ طوفان جرأت
یہ ایں وصف کچھ بھ نہیں میری ہمت
حیات وعمل کا گنہگار ہوں میں
بڑا دکھ ہے مجھ کو کہ بیکار ہوں میں

ضرورت ہے میری حیات وبقا کو
ضرورت ہے میری زمین کو فضا کو
ضرورت ہے ہر ابتدا انتہاء کو
ضرورت ہے تہذیب کو ارتقاء کو
غلط ہے کہ اک حرف تکرار ہوں میں
بڑا دکھ ہے مجھ کو کہ بیکار ہوں میں

(نظم ''بیکاری'')

آج ہر دن سے زیادہ ہے ہلاکت کا اثر
درد ہر رگ میں ہے دوہری ہوئی جاتی ہے کمر
یہ گرانی، یہ مزاج یہ کچھ سکہ زر
قرض خواہوں کی ابھی سے ہوگی یورش گھر پر
اور گھر میں غم حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں
پنجہ مرگ سے ہستی کو چھڑاؤں کیونکر
ظلم کو رحم کے انداز سکھاؤں کیونکر
فرق زریائے مشقت پہ جھکاؤں کیونکر
گرد افلاس کو اکسیر بناؤں کیونکر
میرے قصبہ میں تو محنت کے سوا کچھ بھی نہیں

(نظم ''حقیقتیں'')

الاماں شور بلکتے ہوئے مزدوروں کا
چمنیاں سرد، گرانڈیل کلیں ہیں خاموش

زرد چہروں پہ مچلتا ہے ارادوں کا جلال
گرم نعروں سے ابلتا ہے مقاصد کا خروش
وہ سلگتی ہوئی نظریں یہ دہکتے تیور
یہ گرجتا ہوا غصہ یہ برستا ہوا جوش
لال جھنڈے کے تلے جھومتے بل کھاتے ہیں
گونجتے آہنی پھاٹک پہ چڑھے آتے ہیں

(نظم ''بیکار مزدور'')

ہر طرف ادبار کے طوفان ہیں سیلاب ہیں
بھوک ہے، بیماریاں ہیں، موت کے گرداب ہیں
جاں بلب انسان وفور کرب سے بیتاب ہیں
کتنے دل مجروح کتنی انکھڑیاں پرآب ہیں
آنسوؤں کی اس جھڑی میں مسکرا سکتا نہیں
محترم! بار وراثت میں اٹھا سکتا نہیں
اب مٹالوں گا نہ جب تک میں یہ فرسودہ نظام
مجھ پہ ہیں آرام و راحت عیش و عشرت سب حرام
میری پشتی پر ہیں مفلس میرے ساتھی ہیں عوام
اس خزانے اس حکومت اس ریاست کو سلام
اپنی خاطر فرض انسانی بھلا سکتا نہیں
محترم! بار وراثت میں اٹھا سکتا نہیں

(نظم ''گمراہ ولی عہد'')

کیفؔی کے دوسرے دور کی نظمیں دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں یا پھر ہندوستانی سیاست کے گھٹتے بڑھتے سائے کو اپنے دائرہ اظہار میں لاتی ہیں یہاں ترقی پسندانہ خیالات اور اشترا کی نظریات کا کھل کر اظہار کیا گیا ہے۔کیفؔی کی دوسرے دور کی شاعری کے متعلق مظفر حنفی لکھتے ہیں:

> ''کیفؔی کے یہاں بھی اشترا کی تصورات اور نظریات نے عقیدے کا درجہ حاصل کرلیا ہے اور اسی لئے ان کی نظموں میں فکر جذبہ شدت احساس اور زور بیان کے عناصر نے مل کر ہنگامی موضوعات کو بھی شعری قالب عطا کر دیا ہے اسی شدت احساس اور جذبے کی کارفرمائی نے کیفؔی اعظمی کی ترقی پسندانہ شاعری میں طنزیہ اسلوب کا جادو بھی جگایا ہے۔''(۱)

اس دور کے سیاسی حالات کو موضوع بنا کر لکھی گئی نظمیں ''فیصلہ''، ''تلاش''، ''کب تک''، ''آخری مرحلہ'' وغیرہ خاص اہمیت رکھی ہیں۔ یہ نظمیں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء کے درمیان لگ بھگ دو سال کے وقفہ میں لکھی گئی ہیں ان میں جدید شعور کی عکاسی کے ساتھ شاعر کے لہجے میں احتجاج کا زور بھی محسوس ہوتا ہے:

نگاہوں میں پیچیدہ ہے اضطراب
جھلکتا ہے چہروں سے سوز عتاب
تڑپتے ہیں اپنی حدوں میں جناب
بہم ہو کے طوفاں اٹھاتے نہیں
نگاہوں میں ارجن کا ہے تیر بھی
ہے قبضے میں ٹیپو کی شمشیر بھی
بایں شان گردن میں زنجیر بھی
مرقعے یہ اب دیکھے جاتے نہیں

(نظم ''فیصلہ'')

---

(۱) جہات وجستجو مظفر حنفی طبع اول ۱۹۸۲ء۔

یہ بجھی سی شام یہ سہمی ہوئی پرچھائیاں
خون دل بھی اس فضا میں رنگ بھر سکتا نہیں
آ اتر آ کانپتے ہونٹوں پہ اے مایوس آہ
سقف زنداں پر کوئی پرواز کر سکتا نہیں
جھلملائے میری پلکوں پر مہ و خور بھی تو کیا؟
اس اندھیرے گھر میں اک تارا اتر سکتا نہیں
لوٹ لی ظلمت نے روئے ہند کی تابندگی
رات کے کاندھے پہ سر رکھ کر ستارے سو گئے
وہ بھیانک آندھیاں، وہ ابتری، وہ خلفشار
کارواں بے راہ ہو نکلا، مسافر کھو گئے
ہیں اسی ایوان بے در میں یقیناً رہنما
آ کے کیوں دیوار تک نقشِ قدم گم ہو گئے

......☆☆☆......

دیکھ اے جوش عمل وہ سقف یہ دیوار ہے
ایک روزن کھول دینا بھی کوئی دشوار ہے

(نظم ''تلاش'' سے)

جانے ہم رحم کی درخواست کریں گے کب تک
کب تک آئین کی محتاط مذمت ہوگی
ایک اک نام پہ کہرام مچے گا کب تک
کب تک اس طرح بالاقساط بغاوت ہوگی

(نظم ''کب تک'')

کیفی اعظمی کی ۱۹۴۵ء کے آس پاس کی شاعری کو ناقدین فن نے پارٹی لائن کی شاعری کہا ہے۔ان میں ترقی پسندانہ خیالات عصری ہنگامی اور سیاسی موضوعات کو خطیبانہ انداز میں نظم کیا گیا ہے۔کیفی کے اس دور کی شاعری کا اہم موضوع ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا جذبہ اور عوام کے دلوں میں جوش بھر کر ظلم اور غلامی کے خلاف کمربستہ کرنا ہے اس دور میں مواد شاعری کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے اور ترقی پسندوں نے عصری مسائل اور ہنگامی حالات پر عام فہم زبان میں نظمیں لکھی ہیں اس دور کے سبھی ترقی پسندوں نے اس قسم کے جذبات واحساسات کا اظہار کیا ہے۔کیفی اعظمی کی ایک نہایت اہم نظم ''تربیت'' ہے، جس میں ایک پولیس افسر جو انگریزی حکومت کا ایک مضبوط ستون ہے، مگر اپنے بیٹے کی تربیت انقلابی خیالات سے کرتا ہے اور کہتا ہے:

سن کہ اب جاگی ہوئی تحریک سو سکتی نہیں
جو سہولت باپ کو تھی تجھ کو ہو سکتی نہیں
لٹنے ہی والا ہے دم بھر میں حکومت کا سہاگ
لگنے ہی والی ہے جیلوں دفتروں تھانوں میں آگ
مٹنے ہی والا ہے خوں آشام دیوزر کا راج
آنے ہی والا ہے ٹھوکر میں الٹ کر سر سے تاج
چھٹنے ہی والی ہے ظلمت رسنے ہی والا ہے نور
ہلنے ہی والی ہیں قبریں پھنکنے ہی والا ہے صور
ابھی کھلیں گے نہ پرچم ابھی پڑے گا نہ رن
کہ مشتعل ہے مگر متحد نہیں ہے وطن
پکارتا ہے افق سے لہو شہید وفا کا
کہ ایک ہاتھ سے جھکتی نہیں گلے کی رسن

یہ انتشار، یہ ہلچل، یہ مورچو میں شگاف
مذاق اڑتے ہیں عزم جہاد کا دشمن
پھر ایک بار بڑھو لے کے صلح کا پیغام
پھر ایک بار جلادو شکوک کے خرمن
یہ یاس کیوں؟ یہ تمنائے خودکشی کیسی؟
نوید فتح ہے قلب عوام کی دھڑکن
مٹادو مل کے مٹادو نشاں غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا!
حصار باندھے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے
کھڑے ہیں ہند کے سردار سر اٹھائے ہوئے
شجاع حیدرو ٹیپو کی گود کے پالے
دلیر نانک ورنجیت کے سکھائے ہوئے
فضا میں سرخ پھریرا لٹارہا ہے حیات
ہوا کی زد پہ چراغ عمل جلائے ہوئے
تڑپ کے گرنے ہی والی ہے برق زنداں پر
کھڑے ہیں در پہ اسیر آسرا لگائے ہوئے

(نظم ''تربیت'')

۱۹۴۴ء میں گاندھی، جناح ملاقات کو موضوع بنا کر کیفی نے ''کرن'' نظم لکھی تھی ان کے خیال میں یہ اس وقت کا اہم موضوع تھا کیونکہ دو عظیم رہنماؤں کے درمیان متفق الخیال ہونے پر ملک کی تقدیر کا انحصار تھا۔ اس ملاقات کے تعلق سے کیفی کی ایک اور نظم ''نئے خاکے'' ہے، یہ دونوں نظمیں اس وقت کے سیاسی

حالات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ پھر بھی اس وقت کی ترقی پسند شاعری اور کیفی کی ان نظموں کو مختلف ناقدین نے سپاٹ اور نعرے بازی کی شاعری کہا ہے۔ مثلاً نامی انصاری لکھتے ہیں:

> ''کرن، نئے خاکے، قومی اخبار وغیرہ نظمیں اس زمانے کے سیاسی واقعات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مگر ان میں کوئی فکری گہرائی نظر نہیں ہے۔ انداز بیان سپاٹ اور بے لطف ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات شاعر کے ذہن وشعور میں جذب نہیں ہو سکے ہیں، اور ان کو محض وقتی ہیجان کے تحت نظم کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔'' (۱)

ان نظموں کے متعلق خورشید نعمانی لکھتے ہیں:

> ''ان نظموں میں وقتی تاثر ضرور ہے، لیکن یہ زندہ رہنے والی شاعری نہیں البتہ ان نظموں میں کسی کسی جگہ پر خوبصورت بند یا مصرعے بھی آ جاتے ہیں، جن سے شاعر کی تخلیقی قوت کا پتہ چلتا ہے، بشرطیکہ وہ ٹھیک سے استعمال ہوتی۔'' (۲)

نظم ''کرن'' ملاحظہ ہو:

مطمئن کوئی نفس اے دل رنجور نہیں
اک الگ بیٹھ کے جی لینے کا مقدور نہیں
تجربوں نے وہ لگائے ہیں دلوں میں چرکے
روٹھے مل جائیں گلے آج تو کچھ دور نہیں

زندگی صلح پہ مجبور ہوئی جاتی ہے

رخ سم آلودہ ہواؤں کا بدلنے سا لگا
شوق پژمردہ عناصر میں مچلنے سا لگا

---

(۱) آخر شب کا ہم سفر نامی انصاری مضمون مشمولہ کیفی اعظمی فن اور شخصیت ص ۳۶۷ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء۔
(۲) کیفی اعظمی کی شاعری خورشید نعمانی مضمون مشمولہ کیفی اعظمی فن اور شخصیت ص ۳۶۱ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء۔

کس نے یہ ساز اخوت پہ الاپا دیپک
اک دیا رات کی آغوش میں جلنے سا لگا
تیرگی یاس کی کافور ہوئی جاتی ہے

خار کیا چیز ہیں دو دوست جو ملنا چاہیں
سوز رفتار سے لو دینے لگی ہیں راہیں
وقت نے سینۂ احساس میں لے لی چٹکی
ڈال دیں گرم تقاضوں نے گلے میں بانہیں
آخری شرط بھی منظور ہوئی جاتی ہے

مل گئیں اٹھ کے نگاہیں جو نگہبانوں کی
نبض ابھر آئی سسکتے ہوئے ارمانوں کی
ناخدا جوڑ کے سر بیٹھنے والے ہیں ادھر
اور ادھر سانس اکھڑنے لگی طوفانوں کی
موج کشتی کے تلے چور ہوئی جاتی ہے

اسی فکر کی طویل بحر میں یہ نظم ''نئے خاکے'' بھی اسی تناظر میں لکھی گئی ہے، ''نئی کرن'' کی طرح یہ نظم بھی گاندھی جناح ملاقات سے کیفی کے تاثرات کا اظہار ہے اس میں بھی نئی کرن کی طرح کوئی فنی گہرائی نہیں ہے اسی لئے اس میں تاثر یا دل گرفتگی کے عنصر کا فقدان ہے:

نقوش حسرت مٹا کے اٹھنا خوشی کا پرچم اڑا کے اٹھنا
ملا کے سر بیٹھنا مبارک ترانۂ فتح گا کے اٹھنا
یہ گفتگو گفتگو نہیں ہے بگڑنے بننے کا مرحلہ ہے
دھڑک رہا ہے فضا کا سینہ کہ زندگی کا معاملہ ہے

خزاں رہے یا بہار آئے تمہارے ہاتھوں میں فیصلہ ہے

نہ چین بے تاب بجلیوں کو نہ مطمئن کاروانِ شبنم

کبھی شگوفوں کے گرم تیور کبھی گلوں کا مزاج برہم

شگوفہ وگل کے اس تصادم میں گلستاں بن گیا جہنم

سجالیں سب اپنی اپنی جنت اب ایسے خاکے بنا کے اٹھنا

خزانۂ رنگ ونور تاریک رہگزاروں میں لٹ رہا ہے

عروس گل کا غرور عصمت سیاہ کاروں میں لٹ رہا ہے

تمام سرمایۂ لطافت ذلیل خاروں میں لٹ رہا ہے

گھٹی گھٹی ہیں نمو کی سانسیں چھٹی چھٹی نبض گلستاں ہے

ہیں گرسنہ پھول، تشنہ غنچے، رخوں پہ زردی، لبوں پہ جاں ہے

اسیر ہیں ہم صفیر جب سے خزاں چمن میں رواں دواں ہے

اس انتشار چمن کی سوگند کہ بابِ زنداں ہلا کے اٹھنا

حیات گیتی کی آج بدلی ہوئی نگاہیں ہیں انقلابی

افق سے کرنیں اتر رہی ہیں بکھیرتی نور کامیابی

نئی سحر چاہتی ہے خوابوں کی بزم میں اِذنِ باریابی

یہ تیرگی کا ہجوم کب تک یہ یاس کا اژدہام کب تک

نفاق وغفلت کی آڑ لے کر جئے گا مردہ نظام کب تک

رہیں گے ہندی اسیر کب تک رہے گا بھارت غلام کب تک

گلے کا طوق آ رہے قدم پر کچھ اس طرح تلملا کے اٹھنا

ان نظموں کے علاوہ اس دور کی دوسری جوشیلی نظمیں ہیں ''نئی جنت''، ''ہم''، ''آخری مرحلہ'' اور پھر

''آزادی'' وغیرہ سبھی ہندوستان کے سیاسی حالات کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہیں۔ نظم آزادی میں کیفی سرفروشان جنگ آزادی کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

نظر میں بجلیاں دل میں تڑپ سانسوں میں ہلچل ہے
لبوں پر فتح کا مژدہ جبیں پر سرخ آنچل ہے
جو بڑھ کر تھام لے دامن جوان عشوے اسی کے ہیں
الٹ دے بڑھ کے جو گھونگھٹ حسیں جلوے اسی کے ہیں

نگاہ و دل کو تڑپاتی
چلی آتی ہے آزادی

نظم ''آخری مرحلہ'' میں بغاوت پر آمادہ نوجوانوں کی تصویر کشی ملاحظہ کیجئے:

حصار باندھے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے
کھڑے ہیں ہند کے سردار سر اٹھائے ہوئے
شجاع حیدر و ٹیپو کی گود کے پالے
دلیر نانک ورنجیت کے سکھائے ہوئے
خمار بادۂ اقبال کا نگاہوں میں
لبوں پہ نغمۂ ٹیگور مسکرائے ہوئے
فضا میں سرخ پھریرا لٹا رہا ہے حیات
ہوا کی زد پہ چراغ عمل جلائے ہوئے

باغی نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ملاحظہ کیجئے:

پھر ایک بار بڑھو لے کے صلح کا پیغام
پھر ایک بار جلا دو شکوک کے خرمن

یہ یاس کیوں یہ تمنائے خودکشی کیسی
نویدِ فتح ہے قلبِ عوام کی دھڑکن
مٹادو مل کے مٹادو نشاں غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا

نظم ''نئی جنت'' میں کیفی آزادی کے بعد کا خواب دیکھتے ہوئے کہتے ہیں، یہ حوصلہ محض جذباتی نہیں بلکہ کیفی کی زندگی کی دھڑکن بن چکا ہے:

نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بنائیں گے
آہوں کو رقص، غم کو چہکنا سکھادیا
گیتوں کو دل کی آنچ میں بجلی بنادیا
سوگند گرم کے کی قسم تان سین کی
ہر محفل نشاط میں دیپک جلادیا
وہ سوز بار و سحرا اثر نغمہ خواں ہیں ہم
یہ شک ہماری حب وطن پر فضول ہے
ہم کو دیار ہند کا کانٹا بھی پھول ہے
گیدڑ کی بے حیائی سے جینا نہیں پسند
شہروں کی آن بان سے مرنا قبول ہے
ٹیپو کے لب سے ٹوٹی ہوئی بجلیاں ہیں ہم
صیاد کی قفس کی نحوست مٹائیں گے
کانٹوں کو گدگدا کے تبسم سکھائیں گے
خط اس غرض سے کھینچ رہے ہیں زمین پر

ان زرد وادیوں کو گلستاں بنائیں گے
مصروف زینت چمن وآشیاں ہیں ہم
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بنائیں گے
تڑپ دے کر خس وخاشاک کو بجلی بنائیں گے
کوئی آواز دے دے آتش افشاں چاند تاروں کو
کہ اب خاک وطن کے جھلسے ذرے جگمگائیں گے
اداسی مسکرائے گی بیاباں لہلہائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے
الٹ کر ایک ٹھوکر میں ستم کا راج رکھ دیں گے
اٹھا کر اپنی بستی کو سرِ معراج رکھ دیں گے

(نظم ''نئی جنت'')

اسی عزم وحوصلہ کا اظہار ایک دوسری نظم ''ہم'' میں بھی کیا گیا ہے:

آہوں کو رقص،تم کو چہکنا سکھادیا
گیتوں کو دل کی آنچ میں بجلی بنادیا
سوگند گرم کے کی قسم تان سین کی
ہر محفل نشاط میں دیپک جلادیا
وہ سوز بار وسحر اثر نغمہ خواں ہیں ہم
صیاد کی قفس کی نحوست مٹائیں گے
کانٹوں کو گدگدا کے تبسم سکھائیں گے
خط اس غرض سے کھینچ رہے ہیں زمین پر

ان زرد وادیوں کو گلستاں بنائیں گے
مصروف زینت چمن وآشیاں ہیں ہم
یہ شک ہماری حب وطن پر فضول ہے
ہم کو دیار ہند کا کانٹا بھی پھول ہے
گیدڑ کی بے حیائی سے جینا نہیں پسند
شیروں کی آن بان سے مرنا قبول ہے
ٹیپو کے لب سے ٹوٹی ہوئی بجلیاں ہیں

(نظم ''ہم'')

کیفی چونکہ مارکسی تعلیمات اور اشترا کی نظریات خود بھی رکھتے ہیں اس لئے روس اور سرخ فوج سے ان کی اپنائیت ظاہر ہوتی ہیں اس طرح کی دوسری مثالیں دوسری جنگ عظیم، روسی فوج اور دنیا کے سیاسی حالات کو موضوع بنا کر لکھی گئی نظموں میں نمایاں ہیں، سرخ جنت، استقلال، سوویت یونین اور ہندوستان، یلغار، فتح برلن، ہم آگے بڑھتے ہی جارہے ہیں وغیرہ اس قبیل کی نظمیں ہیں۔ روس کی سرخ فوج کی برلن کی طرف پیش قدمی سے شاعر بہت زیادہ خوشی محسوس کرتا ہے انہیں تاثرات کے نتیجہ میں نظم یلغار وجود میں آئی، اس نظم میں جذبات وخیالات کا اظہار اس طرح ہوا ہے کہ اشعار میں رجز کی شان پیدا ہوگئی ہے، لیکن یہ محض کھوکھلی نعرے بازی نہیں کہی جاسکتی ہے:

جست، کڑکے جیسے برق کوہسار
غیظ گرجے شب میں جیسے آبشار
جوش امنڈے جس طرح ابر بہار
ہل کے طوفاں کا کلیجہ رہ گیا

سر پٹک کے تند دھارا رہ گیا
ہانپ کر رستے میں دریا رہ گیا
شہر میں بل کھا رہی ہے سرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج
فتح کی پڑنے لگیں پرچھائیاں
پھٹ پڑیں آفاق پر رعنائیاں
ارتقا لینے لگا انگڑائیاں
مضمحل لمحوں میں جاں آنے لگی
وقت جھوما زندگی گانے لگی
ظلمتوں میں صبح لہرانے لگی
نوریوں جھلکا رہی ہے سرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج
اب یہ دھارا رخ بدل سکتا نہیں
سامراج اب پھول پھل سکتا نہیں
قصر لعنت اب سنبھل سکتا نہیں
قصر لعنت ڈھا رہی ہے سرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج
فتح کی پڑنے لگیں پرچھائیاں
پھٹ پڑیں آفاق پر رعنائیاں
ارتقا لینے لگا انگڑائیاں

مضمحل لمحوں میں جاں آنے لگی
وقت جھوما زندگی گانے لگی
ظلمتوں میں صبح لہرانے لگی
نوریوں جھلکارہی ہیں سرخ فوج
سوئے برلن جارہی ہی سرخ فوج
اب یہ دھارا رخ بدل سکتا نہیں
سامراج اب پھول پھل سکتا نہیں
قصر لعنت اب سنبھل سکتا نہیں
قصر لعنت ڈھارہی ہے سرخ فوج
سوئے برلن جارہی ہے سرخ فوج

(نظم ''یلغار'')

یہ کیفی کے دل کی آواز بھی تھی کہ برلن کو شکست ہو چنانچہ جب نازی جرمن کی افواج پسپا ہوجاتی ہیں تو وہ خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں اور انہیں ذہنی خوشی اور قلبی سرور حاصل ہوتا ہے کہ وہ خود کو روسی افواج کا حلیف تصور کرتے ہیں اور اس جیت کو اپنے اصول اور نقطہ نظر کی جیت سمجھتے ہیں ان کی نظم فتح برلن میں اسی خوش کا اظہار ہوا ہے:

ڈھل گئی شب صبح عشرت کا پیام آہی گیا
آفتاب ماسکو بالائے بام آہی گیا
جن کو چڑھ تھی علم وحکمت سے ادب سے راگ سے
ہوگئے ٹھنڈے الجھ کر زندگی کی آگ سے
جشن یہ خدا کا ہے او رعید یہ آدم کی ہے

کارنامہ روس کا ہے فتح اک عالم کی ہے

کہہ دو چھلکے کہہ دو برسے مست آنکھوں سے شراب

لہلہائیں عارضوں کے پھول ماتھوں کے گلاب

آج سے آتش نوا کیفی اٹھالے گا رباب

مسکرائے حسن گائے عشق جاگ اٹھے شباب

مضطرب شاعر بھی عنوان طرب پا ہی گیا

کم سے کم آج ایک پہلو تو قرار آ ہی گیا

نظم کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیفی اس فتح سے رومان پرور قسم کا احساس حاصل کرتے ہیں نظم رومانی اور روایتی شاعری کا انداز لئے ہوئے ہے اسی طرح ان کے سیاسی اور سماجی شعور کی ایک دوسری نظم ''تلنگانہ'' ہے یہ نظم انہوں نے اپنے ہم عصروں کی طرح تلنگانہ تحریک کو موضوع بنا کر لکھی ہے۔ اس نظم میں ظلم وستم کے خلاف عوامی احتجاج اور جدوجہد کو انہوں نے پوری طرح ابھارا ہے۔ عوامی جوش اور آہنگ رجزیہ انداز نظم میں پیدا کرتا ہے۔ اس کا اتار چڑھاؤ اور اس میں مختلف بحروں کا استعمال ایک عجیب قسم کا حسن اور تاثر پیدا کرتا ہے۔

کہاں جہاد کہاں جدوجہد کی منزل

مفاہمت نہیں پاتی جہاد کا حاصل

ہوائے تند نے گوندھی ہے زلف آزادی

بغاوتوں نے نکھارا ہے حسن مستقبل

حیات انگڑائی لے کے اپنا نظام اب خود سنبھالتی ہے

جلی ہوئی بستیوں پہ تعمیر عکس شہروں کا ڈالتی ہے

روش روش کو شگوفہ کاری چمن کے سانچے میں ڈھالتی ہے

کلی کلی رنگ اچھالتی ہے

لہو سے سینۂ گیتی کے داغ دھوئے ہیں

جگا کے خاک کی قسمت شہید سوئے ہیں

کہیں کی فوج سہی اس طرف کا رخ نہ کرے

یہاں زمین میں بم من چلوں نے بوئے ہیں

ابھرتی انسانیت کی توہین ہے تشدد کی حکمرانی

جبین تاریخ پر ہے اک داغ آج کی مطلق العنانی

تمہارے ہمراہ فتح ونصرت تمہارے قدموں میں کامرانی

مجاہدو! وہ ہے راجدھانی

آزادی ملنے کے بعد ہندوستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اور حالات نے بڑی تیزی سے اپنا رخ بدلا، آزادی کا زبردست المیہ ملک کا بٹوارہ تھا اس نے زمین نہیں بانٹی دل بانٹ دیئے، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طرف سے فسادات کی آگ بھڑک اٹھی، ہزاروں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی دھرتی کا رنگ لال ہو گیا، آزادی کی ساری خوشیوں نے غم کی سیاہ چادر اوڑھ لی۔ ان سماجی، معاشی، سیاسی تبدیلیوں کا اثر اس دور کے ادبی تقاضوں پر پڑنا ناگزیر تھا ملک کی آزادی اور ملک کی سیاسی تبدیلیوں سے شعر وادب اثر پذیر ہونا لازمی تھا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد ترقی پسند نظم کے موضوعات میں سطحیت خطیبانہ لب ولہجہ اور بلند آہنگی کے خلاف ردعمل کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ ترقی پسند تحریک کی مقبولیت میں بھی کمی آنا شروع ہوگئی۔ بعض ترقی پسند شاعر نئی حسیت پر زور صرف کرنے لگے غرض ادبی دنیا ایک نئی ہلچل میں مبتلا ہوگئی۔ کیفی ان حالات کو گہری نظر سے دیکھتے اور غور کرتے رہے، چنانچہ اس دور کی شاعری میں ان کے یہاں تبدیلی آئی اور انہوں نے عصری احساسات پر پہلے سے زیادہ زور دینا شروع کیا اور اس میں پوری توانائی صرف کی۔ یہ کیفی اعظمی کا تیسرا ادبی یا تخلیقی موڑ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے آثار ان کی ایک رومانی نظم ''ایک بوسہ'' سے ہی نظر آنے

لگے تھے۔۱۹۶۲ء کی تخلیق ''آوارہ سجدے'' میں یہ آثار بخوبی نظر آتے ہیں یہ تبدیلیاں درج ذیل شعری اقتباسات سے اندازہ لگائی جاسکتی ہیں۔

کتنی رنگیں ہے فضا کتنی حسیں ہے دنیا
کتنا سرشار ہے ذوق چمن آرائی آج
اس سلیقے سے سجائی گئی بزم گیتی
تو بھی دیوار اجنتا سے اتر آئی آج
ترے قامت میں ہے انساں کی بلندی کا وقار
دختر شہر ہے تہذیب کا شہکار ہے تو!
اب نہ جھپکے گی پلک، اب نہ ہٹیں گی نظریں!
حسن کا میرے لئے آخری معیار ہے تو

(نیا حسن)

کوئی دیتا ہے در دل پہ مسلسل آواز
او رپھر اپنی ہی آوز سے گھبراتا ہے
اپنے بدلے ہوئے انداز کا احساس نہیں
میرے بہکے ہوئے انداز سے گھبراتا ہے
راز کو ہے کسی ہمراز کی مدت سے تلاش
اور دل صحبت ہمراز سے گھبراتا ہے

(نظم ''دعوت'' سے ماخوذ)

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں

پھول کیا شگوفے کیا چاند کیا ستارے کیا
سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں
رقص کرنے لگتی ہیں مورتیں اجنتا کی
مدتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں
پھول کھلنے لگتے ہیں اجڑے اجڑے گلشن میں
پیاسی پیاسی دھرتی پر ابر چھانے لگتے ہیں
لمحے بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحے بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

(نظم ''ایک بوسہ'')

یہ اشعار کیفی کی شاعری کے ارتقاء کو ظاہر کرتے ہیں فکری گہرائی اور فنی بالیدگی اس کے اہم عناصر ہیں۔اس بارے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

''جھنکار اور آخر شب کی تعمیر و تکمیل کے مرحلوں سے گذر کر کیفی کچھ سے کچھ ہو گئے اور پھر آوارہ سجدے کے ایسے مکمل شاعر بن گئے کہ جواب بھی تعمیر میں ہیں۔''(۱)

شاید کیفی نے محسوس کر لیا تھا کہ زندگی ایک تہہ دار اور پیچیدہ حقیقت ہے،جس کا اظہار متنوع اور رنگا رنگ تجرباتی کیفیات اور تاثرات سے ہی کیا جاسکتا ہے۔آوارہ سجدے کیفی کی ایک اہم نظم ہے، یہ انہوں نے ۱۹۶۲ء میں کمیونسٹ اکائی کے ٹوٹنے پر کہی تھی۔اس کو انہوں نے خاص طور سے بہت اہمیت دی ہے،اس بات کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے تیسرے مجموعے کا نام بھی آوارہ سجدے ہے۔کمیونسٹ اکائی کا ٹوٹنا کیفی کے نزدیک ایک زبردست حادثہ ایک زبردست المیہ تھا، وہ لکھتے ہیں:

''اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کمیونسٹ اکائی ٹوٹ گئی میرے

---

(۱) کیفی اعظمی راج بہادر گوڑ کیفی اعظمی فن اور شخصیت شاہد ماہلی ص ۲۸۰ معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء۔

سجدے آوارہ ہو گئے۔"(۱)

اس مختصر سے جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیفی کو کمیونسٹ انتشار سے سخت صدمہ تھا، جس کی وجہ سے وہ بے حد مایوس ہو گئے تھے ان کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے تھے، جو وہ برابر دیکھتے رہے تھے، لیکن بایں ہمہ رنج و مایوسی ان کا اشتراکیت پر یقین ہنوز باقی تھا لیکن ان کا دل ضرور مجروح ہوا ان کے دل کو جو صدمہ لاحق ہوا اس کا اظہار انہوں نے نظم آوارہ سجدے میں بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے کیا ہے، ان کی غمنا کی ملاحظہ کیجئے:

اب بھی سوز نہاں کل میرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوز نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سر مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں
تم بھی محبوب مرے تم بھی ہو دلدار مرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں تم بھی نہیں
ختم ہے تم پہ مسیحا نفسی چارہ گری
محرم درد جگر تم بھی نہیں تم بھی نہیں
اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں
دور منزل تھی مگر ایسی بھی کچھ دور نہ تھی
لے کے پھرتی رہی رستے ہی میں وحشت مجھ کو

---

(۱) دیباچہ "آوارہ سجدے"، "کیفیات" کیفی اعظمی کلیات کیفی اعظمی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۳۔

ایک زخم ایسا نہ کھایا کہ بہار آجاتی
دار تک لے کے گیا شوق شہادت مجھ کو
راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور میرا راہ نما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا تھا
کہہ دیا عقل نے تنگ آ کے خدا کوئی نہیں

ان مایوس کن احساس کے بعد بھی کیفی ناامید نہیں ہوئے۔ انہوں نے حیات انسانی کے اتار چڑھاؤ خوب دیکھے اور جھیلے ہیں عصری حسیت کی اچھی مثال ان کی نظم ''دوپہر'' ہے، چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

یہ جیت ہار تو اس دور کا مقدر ہے
یہ دور جو کہ پرانا نہیں نیا بھی نہیں
یہ دور جو کہ سزا بھی نہیں جزا بھی نہیں
یہ دور جس کا بظاہر کوئی خدا بھی نہیں
تمہاری جیت اہم ہے نہ میری ہار اہم
کہ ابتدا بھی نہیں ہے یہ انتہا بھی نہیں
یہ کارواں ہے تو انجام کارواں معلوم
کہ اجنبی بھی نہیں کوئی آشنا بھی نہیں
کسی سے خوش بھی نہیں ہے کوئی خفا بھی نہیں
کسی کا حال کوئی مڑ کے پوچھتا بھی نہیں

ان نظموں کے علاوہ ''آوارہ سجدے'' کی وہ نظمیں، جنہیں ناقدین نے کیفی کا اصل رنگ قرار دیا ہے ان میں مکان، آخری رات، عادت، دائرہ، ابن مریم، بہروپنی، پیار کا جشن، گربھ وتی، پیر تسمہ پا، کھلونے

انتشار، ایک لمحہ، زندگی اور چراغاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

آندھیاں توڑ لیا کرتی تھیں شمعوں کی لویں
جڑ دیئے اس لئے بجلی کے ستارے ہم نے
بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورش تعمیر لئے

............☆☆☆............

اپنی نس نس میں لئے محنت پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لئے
دن پگھلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لئے

............☆☆☆............

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو میں بھی اٹھوں تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

(نظم ''مکان'' سے ماخوذ)

چاند ٹوٹا پگھل گئے تارے
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے رات
پلکیں آنکھوں پہ جھکتی آتی ہیں
انکھڑیوں میں کھٹک رہی ہے رات

آج چھیڑو نہ کوئی افسانہ
آج کی رات ہم کو سونے دو

کوئی کہتا تھا، ٹھیک کہتا تھا
سرکشی بن گئی ہے سب کا شعار
قتل پر جن کو اعتراض نہ تھا
دفن ہونے کو کیوں نہیں تیار
ہوش مندی ہے آج سوجانا
آج کی رات ہم کو سونے دو

(نظم ''آخری رات'')

روز بڑھتا ہوں جہاں سے آگے
پھر وہیں لوٹ کے آجاتا ہوں
بارہا توڑ چکا ہوں جن کو
انہیں دیواروں سے ٹکراتا ہوں
روز بستے ہیں کئی شہر نئے
روز دھرتی میں سماجاتے ہیں
زلزلوں میں تھی ذرا سے گرمی
وہ بھی اب روز ہی آجاتے ہیں
خیرت اپنی لکھا کرتا ہوں
اب تو تقدیر میں خطرہ بھی نہیں
اپنے ہاتھوں کو پڑھا کرتا ہوں

کبھی قرآں، کبھی گیتا کی طرح
چند ریکھاؤں میں سیماؤں میں
زندگی قید ہے سیتا کی طرح
رام کب لوٹیں گے معلوم نہیں
کاش راون ہی کوئی آجاتا

(نظم ''دائرہ'')

ایک گردن پہ سیکڑوں چہرے
اور چہرے پہ ہزاروں داغ
اور ہر داغ بند دروازہ
روشنی ان سے آ نہیں سکتی
روشنی ان سے جا نہیں سکتی
اس نے مجھ کو الگ بلاک کے کہا
آج کی زندگی کا نام ہے خوف
خوف ہی وہ زمین ہے جس میں
فرقے اگتے ہیں، فرقے پلتے ہیں
دھارے ساگر سے کٹ کے چلتے ہیں
خوف جب تک دلوں میں باقی ہے
صرف چہرہ بدلتے رہنا ہے
صرف لہجہ بدلتے رہنا ہے

کوئی مجھ کو مٹا نہیں سکتا

جشن آدم منا نہیں سکتا

(نظم ''بہروپنی'')

پیار کا جشن نئی طرح منانا ہوگا

غم کسی دل میں سہی غم کو مٹانا ہوگا

تیرے ملنے کی خوشی درد نہی جاتی ہے

ہم کو ہنسنا ہے تو اوروں کو ہنسانا ہوگا

کانپتے ہونٹوں پہ پیان وفا کیا کہنا

تجھ کو لائی ہے کہاں لغزش پا کیا کہنا

میرے گھر میں ترے مکھڑے کی ضیا کیا کہنا

آج ہر گھر کا دیا مجھ کو جلانا ہوگا

(نظم ''پیار کا جشن'')

کیفی نے ان نظموں میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ ضبط و تحمل اور کشادہ ذہن کے پختہ احساسات و تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور نظم کیفی اعظمی کی ''ابن مریم'' ہے۔ اس میں زندگی کی صنائی کے گہرے تاثر اور رنگ کے ساتھ اس کا بدنما رخ بھی نمایاں ہے اس میں کیفی ایک مجبور و بے بس انسان کی علامت کے طور پر خود کو پیش کرتے ہیں:

تم خدا ہو

خدا کے بیٹے ہو

یا فقط امن کے پیمبر ہو

یا کسی کا حسیں تخیل ہو
جو بھی ہو مجھ کو اچھے لگتے ہو
مجھ کو سچے لگتے ہو
ایک گردن پہ سیکڑوں چہرے
اور چہروں پر ہزاروں داغ
اور ہر داغ بند دروازہ
روشنی ان سے جا نہیں سکتی
اس نے مجھ کو الگ بلا کے کہا
آج کی زندگی کا نام ہے خوف
خوف ہی وہ زمین ہے، جس میں
فرقے اگتے ہیں، فرقے پلتے ہیں
دھارے ساگر سے کٹ کے چلتے ہیں
خوف جب تک دلوں میں باقی ہے
صرف چہرہ بدلتے رہنا ہے
صرف لہجہ بدلتے رہنا ہے
کوئی مجھ کو مٹا نہیں سکتا
جشنِ آدم منا نہیں سکتا
مجھ کو دیکھو کہ میں تھکا ہارا
پھر رہا ہوں یگوں سے آوارہ
تم یہاں سے ہٹو تو آج کی رات

سو رہوں میں اسی چبوترے پر

(نظم ''ابن مریم'')

اس نظم کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن رقم طراز ہیں:

''کیفی اعظمی نے ابن مریم میں ہمہ جہتی تصویر بنائی ہے، جس میں رمزیت کی ایک تہہ دوسری تہہ سے ملتی چلی جاتی ہے بات تو صرف اتنی سی ہے کہ حضرت عیسیٰ کا مجسمہ ممبئی میں ساحل سمندر کے قریب نصب ہے اور رات کو ایک تھکا ماندہ بھوک سے نڈھال اور نیند سے چور نوجوان اس مجسمہ کے شہ نشین پر سونا چاہتا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر یہ مجسمہ وہاں نہ ہوتا تو وہ آج کی رات آرام سے گزار لیتا اور وہاں اس مجسمہ کے ہونے سے فائدہ بھی کیا ہے۔ اس مجسمہ کی جگہ تو ویت نام کے جنگلوں میں تھی، جہاں عیسیٰ کے نام لیوا خون کی ہولی کھیل رہے ہیں کیفی نے اس نظم میں قوت بیان اور تہہ در تہہ رمزیت سے کام لیا ہے اس نے اسے نئی قوت بخش دی ہے، کیفی کی دوسری نظموں کی طرح اس نظم میں صراحت اور غیر ضروری تفصیل نے جگہ نہیں پائی ہے۔''(۱)

''چراغاں'' کیفی کی ایک بہت مشہور نظم ہے، جو انہوں نے جشن یوم جمہوریہ ۲۶ر جنوری ۱۹۷۴ء کے موقع پر لکھی تھی۔ کیفی ملک وقوم کی بدحالی پر طنز تو کرتے ہیں بھرپور طنز۔ لیکن رجائیت کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہوں نے دوسرے تمام چراغ بجھتے دیکھے ہیں لیکن امید کا دیا برابر روشن رکھتے ہیں۔ یہی اس نظم کا مرکزی خیال ہے کہ انسان کچھ بھی مصائب اور نامرادیوں سے دوچار ہو لیکن اسے امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے کیونکہ ''مشکلے نیست کہ آساں نشود'' صبر و ہمت کی بہر حال ضرورت ہے، اس نظم کی خوبی اس کا بھرپور طنز اور رجائیت ہے، ملاحظہ کیجئے:

ایک دو بھی نہیں چھبیس دیئے

ایک اک کر کے جلائے میں نے

---

(۱) جدید اردو ادب ڈاکٹر محمد حسن ص ۱۵۶ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی ۱۹۷۵ء۔

اک دیا نام کا خوش حالی کے
اس کے جلتے ہی یہ معلوم ہوا
کتنی بدحالی ہے
پیٹ خالی ہے مرا جیب مری خالی ہے
اک دیا نام کا یک جہتی کے
روشنی اس کی جہاں تک پہونچی
قوم کو لڑتے جھگڑتے دیکھا
ماں کے آنچل میں ہیں جتنے پیوند
سب کو ایک ساتھ ادھڑتے دیکھا
دور سے بیوی نے جھلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیئے اتنے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر میں نہ جھروکا نہ منڈیر
طاق سپنوں کے سجا رکھے ہیں
آیا غصے کا ایک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیئے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے!

کیفی کی ایک نہایت کامیاب طنزیہ نظم ''کھلونے'' ہے۔ اس نظم میں انہوں نے ملک میں ہر طرف پھیلی سیاسی بے چینیوں، سیاسی رہنماؤں کے داؤ پیچ اور ان کے جھوٹے وعدوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

انہوں نے اپنے طرز خاص سے اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق سیاسی رہنماؤں دانشوران ملک وملت اور وزراء وغیرہ کی نا اہلی پر سخت طنز کیا ہے اور یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ اگر اسی طرح کچھ اور دنوں تک ملک کی باگ دوڑ ایسے ہی نا اہل اور نا کارہ لوگوں کے ہاتھوں میں رہی تو ملک کا بیڑہ غرق ہونے میں دیر نہیں ہے ہر طرف بدامنی اور انتشار پھیل جائے گا۔

ریت کی ناؤ جھاگ کے مانجھی
کاٹھ کی ریل سیپ کے ہاتھی
ہلکی بھاری پلاسٹک کی کلیں
موم کے چاک جو رکیں نہ چلیں
راکھ کے کھیت، دھول کے کھلیاں
بھانپ کے پیرہن دھوئیں کے مکان
نہر جادو کی پل دعاؤں کے
جھنجھنے چند یوجناؤں کے
سوت کے چیلے مونج کے استاد
تیشے دفتی کے، کانچ کے فرہاد
عالم آٹے کے اور رَوے کے امام
اور پنّی کے شاعران کرام
اون کے تیر، روئی کی شمشیر
صدر مٹی کا اور ربر کے وزیر
اپنے سارے کھلونے ساتھ لئے
دست خالی میں کائنات لے

دو ستونوں میں باندھ کے رسی

ہم خدا جانے کب سے چلتے ہیں

نہ تو گرتے ہیں نہ سنبھلتے ہیں

کیفی نے اپنی نظموں میں مذہبی مسائل و موضوعات کو کم ہی دخل دیا ہے اگر کہیں کچھ اشارے ہیں تو ان کی نوعیت محض ایک شاعرانہ تصور ہی ہے اس بات کا ان کو بخوبی ادراک حاصل ہے، کہ مذاہب عالم اپنے ابتدائی یا ارتقائی عہد میں انقلابی رہے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک مدت کے بعد مذہب صرف چند رسموں کا نام ہی رہ جاتا ہے اختلاف زبان کی وجہ سے مذہبی کتب کو سمجھ سکنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات تلخ ضرور ہے کہ مذہب پیشوا اپنی ساکھ بنانے اور اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے اپنے من مانی باتیں یا عقائد کا پرچار کرتے ہیں حقیقت میں بنیادی طور سے یہ صرف ان کے ذہنوں کی اختراع ہوتی ہے، جس کا اصل میں مذہب سے لگاؤ نہیں ہوتا۔ حد یہ کہ آج مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام ہے کہ قرآن شریف کی صرف تلاوت کافی ہے باعث برکت اور باعث ثواب ہے۔ اس طرح ہندو دھرم میں صرف گیتا رامائن کا پاٹھ ضروری، معنیٰ مطلب کی کیا ضرورت۔ اس طرح عوام الناس روح مذہب سے واقف نہیں ہو پاتے جو مولوی صاحب یا پنڈت جی سمجھا دیں وہی ان کا مذہب بن جاتا ہے۔ اس طرح چند روایات اور مراسم میں الجھ کر انسان اور مذہب دونوں کی افادیت ختم ہو جاتی ہے حالانکہ ان کتب کا نزول صرف اسی لئے ہوا تھا کہ عوام سمجھیں اور ان کی تعلیمات سے کسب فیض کر سکیں۔ اسے ہم رہبران ملت کی گہری سازش کہہ سکتے ہیں، جس کے تحت انہوں نے اپنے حلوے مانڈے کا بہترین انتظام کر رکھا ہے۔ انہیں حقائق کو کیفی نے اپنی نظم ''پیر تسمہ پا'' میں نہایت خوبصورتی سے نظم کیا ہے، ملاحظہ کیجئے:

میرے کاندھے پہ بیٹھا کوئی

پڑھتا رہتا ہے انجیل و قرآن و وید

مکھیاں کان میں بھنبھناتی ہیں

زخمی ہیں کان

اپنی آواز کیسے سنوں

رانا ہندو تھا اکبر مسلمان تھا

سنجے وہ پہلا انسان تھا

ہستناپور میں جس نے قبل مسیح

ٹیلی ویژن بنایا تھا

اور گھر بیٹھے ایک اندھے راجہ کو

یدھ کا تماشا دکھایا

آدمی چاند پر آج اترا تو کیا

یہ ترقی نہیں

اب سے پہلے بہت پہلے

جب ذرہ ٹوٹا نہ تھا

چشمہ جوہر کا پھوٹا نہ تھا

فرش سے عرش تک جا چکا ہے کوئی

یہ اور ایسی بہت سی جہالت کی باتیں

میرے کاندھے پہ ہوتی ہیں

کاندھے جھکے جا رہے ہیں

قد میرا رات دن گھٹ رہا ہے

سر کہیں پاؤں سے مل نہ جائے

''آوارہ سجدے'' کی نظموں میں کیفی نے عصری مسائل اور ترقی پسندانہ موضوعات کو اپنی نظموں کا

موضوع بنایا ہے۔ ان میں ''نہرو''، ''دوسرا طوفان'' ''پہرہ''، ''تاشقند''، ''فرغانہ'' ''ماسکو''، ''لینن'' ''بنگلہ دیش'' اور ''دھماکہ'' وغیرہ نظمیں شامل ہیں ان موضوعاتی ترقی پسندانہ نظموں میں ''آخر شب'' کی طرح بلند آہنگی خطابت اور جذباتیت نہیں ہے بلکہ ایک رکے ہوئے طوفان کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔

عزم کا کوہ گراں درد کی دیوار ہیں ہم
زخم کا زخم ہیں تلوار کی تلوار ہیں ہم
جیسے جھپکی نہیں صدیوں سے یہ بوجھل پلکیں
آج کی رات کچھ اس طرح سے بیدار ہیں ہم
جال سرحد سے اٹھا جال بچھانے والے
ہم وہ راہی ہیں جو منزل کی خبر رکھتے ہیں
پاؤں کانٹوں پہ شگوفوں پہ نظر رکھتے ہیں
کتنی راتوں سے نچوڑا ہے اجالا ہم نے
رات کی قبر پہ بنیاد سحر رکھتے ہیں
او اندھیرے کے خدا شمع بجھانے والے

(نظم ''پہرہ'' سے ماخوذ)

یہی تحفہ ہے یہی نذرانہ
میں جو آوارہ نظر لایا ہوں
رنگ میں تیرے ملانے کیلئے
قطرۂ خون جگر لایا ہوں
اے گلابوں کے وطن

(نظم ''فرغانہ'')

خیر ہو بازوئے قاتل کی مگر خیر نہیں
آج مقتل میں بہت بھیڑ نظر آتی ہے
کردیا تھا کبھی ہلکا سا اشارہ جس سمت
ساری دنیا اسی جانب کو مڑی جاتی ہے

حادثہ کتنا کڑا ہے کہ سر منزل شوق
قافلہ چند گروہوں میں بٹا جاتا ہے
ایک پتھر سے تراشی تھی جو تم نے دیوار
اک خطرناک شگاف اس میں نظر آتا ہے
دیکھتے ہو تو کوئی صلح کی تدبیر کرو
ہوسکیں زخم رفو جس سے وہ تقریر کرو
عہد پیچیدہ مسائل ہیں، سوا پیچیدہ
ان کو سلجھاؤ صحیفہ کوئی تحریر کرو

(نظم ''لینن'' سے ماخوذ)

نظم ''دھماکہ'' کے یہ اشعار دیکھئے:

کوئی چوراہا ہو چاہے کوئی ناکہ دوستو
ہر گھڑی ہر دم کوئی تازہ دھماکہ دوستو

یہ دھماکہ بس دھماکہ ہے
دھماکے کے سوا کچھ بھی نہیں
روٹی دے سکتا نہیں
یہ روزی دے سکتا نہیں

یہ کچھ بھی دے سکتا نہیں
اس کی جیبوں میں نہ دنیا ہے نہ دیں
اس کی مٹھی میں نہ زر ہے نہ زمیں

(''دھاکہ'' سے ماخوذ)

یہی تحفہ ہے یہی نذرانہ
میں جو آوارہ نظر لایا ہوں
رنگ میں تیرے ملانے کیلئے
قطرۂ خون جگر لایا ہوں

اے گلابوں کے وطن

چوم لینے دے مجھے ہاتھ اپنے
جن سے توڑی ہیں کئی زنجیریں
تو نے بدلا ہے مشیت کا مزاج
تو نے لکھی ہیں نئی تقدیریں

انقلابوں کے وطن

(''فرغانہ'' سے ماخوذ)

نظم ''بنگلہ دیش'' کے یہ اشعار دیکھئے:

یہ جو دنیا کا پرانا نقشہ
میز پر تم نے بچھا رکھا ہے
اس میں کاواک لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
تم مجھے اس میں کہاں ڈھونڈ ھتے ہو

میں اک ارمان ہوں دیوانوں کا
سخت جاں خواب ہوں کچلے ہوئے انسانوں کا
لوٹ جب حد سے سوا ہوتی ہے
ظلم جب حد سے گزر جاتا ہے
میں اچانک کسی کونے میں نظر آتا ہوں
کسی سینے سے ابھر آتا ہوں

(نظم ''بنگلہ دیش'' سے ماخوذ)

کیفی کی شناخت باقاعدہ طور پر ان کی نظموں گربھ وتی، بہروپنی، پیار کا جشن انتشار اور زندگی سے ہوتی ہے، چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

پیار کا جشن نئی طرح منانا ہوگا
غم کسی دل میں سہی غم کو مٹانا ہوگا
کانپتے ہونٹوں پہ پیمانِ وفا کیا کہنا
تجھ کو لائی ہے کہاں لغزشِ پا کیا کہنا
میرے گھر میں ترے مکھڑے کی ضیا کیا کہنا
آج ہر گھر کا دیا مجھ جلانا ہوگا!

(نظم ''پیار کا جشن'' سے ماخوذ)

میں کس کو اپنے گریباں کا چاک دکھلاؤں
کہ آج دامن یزداں بھی تار تار سا ہے
تمام جسم ہے بیدار فکر خوابیدہ
دماغ پچھلے زمانے کی یادگار سا ہے

سب اپنے پاؤں پہ رکھ رکھ کے پاؤں چلتے ہیں
خود اپنے دوش پہ ہر آدمی سوار سا ہے
کوئی تو سود چکائے کوئی تو ذمہ لے
اس انقلاب کا جو آج تک ادھار سا ہے

(نظم ''انتشار'' سے ماخوذ)

آج اندھیرا میری نس نس میں اتر جائے گا
آنکھیں بجھ جائیں گی، بجھ جائیں گے احساس و شعور
اور یہ صدیوں سے جلتا سا سلگتا سا وجود
اس سے پہلے کہ سحر ماتھے پہ شبنم چھڑکے
اس سے پہلے کہ مری بیٹی کے وہ پھول سے ہاتھ
گرم رخسار کو ٹھنڈک بخشیں
اس سے پہلے کہ مرے بیٹے کا مضبوط بدن
تنِ مفلوج میں شکتی بھر دے
اس سے پہلے کہ مری بیوی کے ہونٹ
میرے ہونٹوں کی تپش پی جائیں
راکھ ہو جائے گا جلتے جلتے
اور پھر راکھ بکھر جائے گی
زندگی کہنے کو بے مایہ سہی
غم کا سرمایہ سہی
میں نے اس کیلئے کیا کیا نہ کیا

کبھی آسانی سے اک سانس بھی ہمراز کو اپنا نہ دیا

آج سے پہلے بہت پہلے

اسی آنگن میں

دھوپ بھرے دامن میں

میں کھڑا تھا، مرے تلووں سے دھواں اٹھتا تھا

ایک بے نام سا بے رنگ سا خوف

کچے احساس پہ چھایا تھا کہ جل جاؤں گا

میں پگھل جاؤں گا

اور پگھل کر میرا کمزور سا ''میں''

قطرہ قطرہ مرے ماتھے سے ٹپک جائے گا

رو رہا تھا مگر اشکوں کے بغیر

چیختا تھا مگر آواز نہ تھی

موت لہراتی تھی سو شکلوں میں

میں نے ہر مشکل کو گھبرا کے خدا مان لیا

(نظم ''زندگی'' سے ماخوذ)

اس انقلابی اور افراتفری کے دور میں کیفی نے کچھ اچھی قسم کی رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں، جن میں نذرانہ اور ایک لمحہ خاص طور سے اہمیت رکھتی ہیں۔

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا

اور ان میں بھی وہی اک لمحہ

جس میں دو بولتی آنکھیں

چائے کی پیالی سے جب اٹھیں

تو دل میں ڈوبیں

ڈوب کے دل میں کہیں

آج تم کچھ نہ کہو

آج میں کچھ نہ کہوں

بس یونہی بیٹھے رہو

ہاتھ میں ہاتھ لئے

غم کی سوغات لئے

گرمیٔ جذبات لئے

کون جانے کہ اسی لمحہ میں

دور پربت پہ کہیں برف پگھلنے ہی لگے

(نظم ''ایک لمحہ'' سے ماخوذ)

''آوارہ سجدے'' کے بعد کی نظموں میں کیفی کا وہ رنگ نظر آتا ہے، جو ان کی پہچان کا درجہ رکھتا ہے ان نظموں میں پختگی اور جدید فنی اسلوب اور رویہ کی جھلک ہے۔ آوارہ سجدے کے بعد کی نظموں میں لکھنؤ تو نہیں، نذر کراچی، کسان، سومناتھ، مقتل بیروت، میرا ماضی میرے کاندھے پر، سانپ جاگ گئے، شانتی بن کے قریب، گم شدہ شہر، وصیت، ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس اور بن باس وغیرہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں سے زیادہ تر سرمایہ میں شامل ہیں۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ الگ سے بھی کتابچہ کی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ ان نظموں سے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے:

عزا میں بہتے تھے آنسو یہاں لہو تو نہیں

یہ کوئی اور جگہ ہوگی لکھنؤ تو نہیں

یہاں تو چلتی ہیں چھریاں زبان سے پہلے
یہ میر انیس کی آتش کی گفتگو تو نہیں

(نظم ''لکھنؤ تو نہیں'')

عجب کیا دامن یوسف کی عظمت ان کو مل جائے
کراچی میں جو کچھ تار گریباں چھوڑ آیا ہوں
پریشاں خواب جتنے سندھ کی زلفوں نے بخشے تھے
انہیں کے نام وہ خواب پریشاں چھوڑ آیا ہوں
جہاں ملتی ہے بے مانگے بھی سب کو دین کی دولت
میں اس بستی میں اپنا دین و ایماں چھوڑ آیا ہوں

(نذر کراچی سے ماخوذ)

اے صبا لوٹ کے کس شہر سے تو آتی ہے
تیری ہر لہر سے بارود کی بو آتی ہے
خون کہاں بہتا ہے انسان کا پانی کی طرح
جس سے تو روز یہاں کرکے وضو آتی ہے
میری کیوں مانو گے یہ پوچھ لو ہتھیاروں سے
کون اک شہر کو شمشان بنادیتا ہے
کب اٹھائے گا خدا حشر خدا ہی جانے
آدمی روز کوئی حشر اٹھادیتا ہے
اے صبا اب ہو جو بیروت کی گلیوں میں گزر
اور ترے سامنے آجائے کوئی تازہ کھنڈر

اس سے کہہ دینا کہ بھارت کا بھی سینہ ہے نگار

ہل گیا کوہِ ہمالہ جو سنی تیری پکار

غم نہ کر ہاتھ اگر تیرے قلم ہوجائیں

جوڑ دیں گے تیرے بازو میں یہ بانہیں اپنی

جتنے کانٹے بھی بچھاتا ہو بچھالے کوئی

تیری راہوں سے جدا ہوں گی نہ راہیں اپنی

(نظم ''مقتل بیروت'')

گر خدا ٹوٹے گا ہم تو نہ بنا پائیں گے

اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑے نہ اٹھا پائیں گے

تم بتاؤ تو خدا جانے بناؤ کیسا

اپنے جیسا ہی بنایا تو قیامت ہوگی

پیار ہوگا نہ زمانے میں محبت ہوگی

دشمنی ہوگی عداوت ہوگی

ہم سے اس کی نہ عبادت ہوگی!

وحشت بت شکنی دیکھ کے حیران ہوں میں

بت پرستی میرا شیوہ ہے کہ انسان ہوں میں

اک نہ اک تو بت ہر اک دل میں چھپا ہوتا ہے

اس کے سو ناموں میں اک نام خدا ہوتا ہے

(''سومناتھ'' سے ماخوذ)

وہی خستہ بدحال

قرض کے پنجۂ خونی میں نڈھال

اس درانتی کے طفیل

حال سے ہوگا حسیں استقبال

اٹھتے سورج کو ذرا دیکھو تو

ہوگیا سارا افق لالوں لال

(نظم ''کسان'' سے ماخوذ)

پیٹ ہی پیٹ میرا جسم ہے دل ہے نہ دماغ

کتنے اوتار بڑھے لیکے ہتھیلی پہ چراغ

دیکھتے رہ گئے دھو پائے نہ ماضی کے یہ داغ

مل لیا ماتھے پہ تہذیب کا غازہ لیکن

بربریت کا ہے جو داغ وہ چھوٹا ہی نہیں

گاؤں کے آباد کئے شہر بسائے ہم نے

رشتہ جنگل سے جو اپنا ہے وہ ٹوٹا ہی نہیں

(نظم ''میرا ماضی میرے کاندھے پر'')

کیفی کے ابتدائی زمانے کا سب ہی کلام قریب قریب محفوظ نہیں ہے تاہم جو تھوڑا سا دستیاب ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ابتدائی مثالی کردار اہلبیت اطہار اور ائمہ معصومین تھے، جو ان کو ورثے کے طور پر حاصل ہوئے تھے۔ کیفی کے آباء واجداد اثنا عشری عقیدہ رکھتے تھے اس لئے ذکر اہلبیت مجالس عزا کی محافل میں شروع ہی سے ان کو شرکت کے مواقع میسر ہوتے ہوں گے نیز گھر میں بھی یہی ذکر وفکر کی سرگرمیاں تھیں چنانچہ آل اطہار کی عظمتیں ان کے شعور میں اوائل عمری ہی سے رچ بس گئی تھیں، اس

لئے انہوں نے ان کرداروں کو انقلاب کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ کیفی کے اس دور کی تخلیقات میں ''مزدوروں کا پیشوا''، ''حسین کا عزم'' اور ''حسین کی آخری نماز'' وغیرہ اہم ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکثر نوجوان سوشلزم کے خیالات سے متاثر ہو رہے تھے خصوصاً شیعہ عقائد کے نوجوانوں کے لئے حضرت علیؑ کا کردار اور واقعہ کربلا سوشلزم کی طرف آنے کا نقطۂ آغاز تھا۔ نظم مزدوروں کے پیشوا میں کیفی نے حضرت علی کو پہلا انقلابی اور پہلا اشترا کی کہا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ تمام سرمایہ غیر مطبوعہ رہ گیا ہے۔ اس نظم کے متعلق نجابت ادیب لکھتے ہیں:

> ''کیفی کی نظم مزدوروں کا پیشوا (غیر مطبوعہ) ان کے آئیڈیل کا اظہار یہ ہے، جہاں ان کو مزدور و محنت کش کے وقار کو بلندی، جاں باز سپاہی کو سرخ روئی، علم و درس انسانیت خطرے میں پڑ کر بھی تحفظ انسانیت کا درس، جبر و ظلم کے خلاف آواز، احتجاج، بندہ اور سلطاں میں یکسانیت شاہانہ غربت اور ایسے ہی لا تعداد اوصاف نظر آتے ہیں کیفی نے ان اوصاف کو بیان کرتے ہوئے پیشوائے قوم و ٹھیکیداران ملت کو دعوت فکر و عمل دی ہے۔''(۱)

اس نظم کے کچھ دستیاب اشعار ملاحظہ کیجئے:

نگاہ شوق تھم کیوں جرات پرواز کرتی ہے
یہی مزدور ہے جس پر خدائی ناز کرتی ہے
اسی کا بیلچہ تھالوں میں امرت گھول دیتا ہے
جبین ارض کی پر رعب گرہیں کھول دیتا ہے
اسی کی تیغ کا دم خم ہے فرمان پیمبر میں
اٹھی یہ ہی احد میں بدر میں خندق میں خیبر میں

(۱) کیفی اعظمی کے ابتدائی تخلیقی آئیڈیل۔ نجابت ادیب ''کیفی اعظمی: فن اور شخصیت'' ۴۴۲ شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء

اسی کی نبض میں شعلہ حمیت کا بھڑکتا ہے
اسی کی مٹھیوں میں حریت کا دل دھڑکتا ہے
دیا انسانیت کا درس خوں آشام بندوں کو
سدھایا پھاند کر خطرہ میں دختر کش درندوں کو
جہالت کی لحد پر مشعل علم وہنر رکھ دی
شب تاریک کے دامن میں بنیاد سحر رکھ دی
پرویا ایک ہی رشتہ میں بندہ اور سلطاں کو
کوئی ترتیب دے جس طرح سے خواب پریشاں کو
مٹا کر رسم کہنہ نظم نو کی ابتدا کی ہے
یہ پہلا انقلابی ہے یہ پہلا اشتراکی ہے
نظر اٹھ کر جو اس شاہانہ غربت سے ملاتی ہے
کلیجہ تھام کر سرمایہ داری بیٹھ جاتی ہے
کہاں ہیں وہ جو خود کو پیشوائے قوم کہتے ہیں
ہوس کے حرص کے الجھے ہوئے جھرمٹ میں رہتے ہیں
پرکھ لیں دیکھ لیں درس تمدن جن کو ازبر ہے
یہ مزدوروں کا لیڈر ہے یہ جاں بازوں کا لیڈر ہے
تڑپ کر تلملا کر مفلس ومقہور اٹھے ہیں
اٹھایا ہے تری تعلیم نے مزدور اٹھے ہیں
سلگ اٹھے گا جب دامن نظام مہربانی کا
صلہ کیفی تجھی سے لے گا اس آتش بیانی کا

حضرت امام حسین ایک ایسے مثالی کردار ہیں، جو معرکہ حق و باطل میں اپنی اوراپنے خاندان کی جانوں کا نذرانہ دے کر کامیاب ہوجاتے ہیں اور اسلام کو اپنی اور اپنے محبان کی قربانیاں دے کر ابدی زندگی عطا کردیتے ہیں۔ان کے اس عظیم الشان عزم وحوصلہ سے متاثر ہوکر کیفی نے حسین کا عزم اور حسین کی آخری نماز جیسی معرکتہ الآ راء نظمیں تخلیق کیں۔ یہ دونوں تخلیقات بھی کیفی کے کسی مجموعے میں موجود نہیں ہیں حسین کا عزم قصیدے کی ہیئت میں لکھی گئی ایک طویل نظم ہے،اس نظم کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیلئے پیش ہیں:

یاد ہے وہ معصیت زا تیرگی چھائی ہوئی
عصمت کونین جب پھرتی تھی گھبرائی ہوئی
قلب گیتی میں گرجتا تھا دفینوں کا غرور
زندگی فاقوں کے صدمے سے تھی مرجھائی ہوئی
مسند اسلام پر قابض تھا الحاد یزید
دہریت تھی مطلع ایماں پہ منڈلاتی ہوئی
آہ جو اسلام تھا فطرت کا پہلا شاہکار
تھی اسی اسلام کی جاں ہونٹ پر آئی ہوئی

......☆☆☆......

کون لڑسکتا ہے یوں گھر کر ہجوم یاس میں
تین دن کی بھوک میں سولہ پہر کی پیاس میں

......☆☆☆......

امن کی خاطر بقائے حریت کے واسطے
ظالموں سے بدمعاشوں سے ستمگاروں سے جنگ

جادہ تسلیم پر انسانیت کے نام پر
خونیوں سے بے حیاؤں سے سیہ کاروں سے جنگ
نوع انساں کو غلامی سے چھڑانے کیلئے
دیوشاہی سے حکومت کے پرستاروں سے جنگ
موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اظہار حق
چھاؤں میں تیغوں کی بے دینوں سے زرداروں سے جنگ

......☆☆☆......

اک مکمل درس عبرت ہے حسین ابن علی
کٹ گیا سر بیعت فاسق نہ کی آخر نہ کی
آفریں اے افتخار فاتح بدرو حنین
آفریں صد آفریں اے بیکس وتنہا حسین

......☆☆☆......

حریت کو آج بھی ہے ابن حیدر کی تلاش
وقت کو پھر ہے کروڑوں میں بہتر کی تلاش
پھر فضا میں کروٹیں لیتا ہے پرچم موت کا
زندگی کو پھر ہے اک جاں باز رہبر کی تلاش
دیکھنا کیفؔی نشان حریت لہرائے گا
جب جہاں کو عزم شاہ کربلا مل جائے گا

اس منظوم خراج عقیدت میں کیفؔی اعظمی نے حضرت امام حسینؑ اوران کے پورے گھرانے کو حریت اور عظمت انسانی کے علمبرداروں کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس موقع پر کیفؔی نے

روایتی طور سے اسباب گریہ فراہم کرنے کی طرز فکر سے کام نہ لے کر ان علامتوں سے زندگی کو بنانے اور سنورنے کے ساتھ ساتھ ظلم وبربریت کے خلاف احتجاج اور جبر وتشدد کو بے نقاب کر دینے کا سلیقہ اور حوصلہ دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں کسی منزل پر قنوطیت کا شائبہ نہیں محسوس ہوتا ہے، اس ضمن میں پروفیسر محمد حسن صاحب رقم طراز ہیں:

''مرثیوں کی روایت میں پیدا ہونے والے شاعر نے آنکھوں سے ماتم کے آنسو پونچھے ہیں اور اپنی شاعری کو قنوطیت کے اندھیروں سے محفوظ رکھا ہے اور اندھیروں کو دور کرنے کے لئے تابناک تصور تاریخ کو اپنایا ہے۔ اسی تصور ہی سے اعتماد حاصل کیا ہے۔''(۱)

مندرجہ نظم کی طرح واقعات کربلا کے متعلق کیفی کی ایک دوسری نظم حسین اور آخری نماز ہے۔ یہ نظم بھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں کم وبیش اسی طرح کے جذبات وخیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ملاحظہ کیجئے:

زلزلہ افگن جواں گھوڑوں کو کڑکاتے ہوئے
قلب گیتی توڑتے دروں کو دھڑکاتے ہوئے
مورچہ در مورچہ پہلو بہ پہلو صف بہ صف
اتنے کافر بڑھ رہے تھے اک نمازی کی طرف
وہ نمازی وہ مجاہد جس نے ہنگام سپہر
روک لی تھی سجدہ خالق کی خاطر تیغ تیز
نور چشم مصطفیٰ لخت دل شیر اللہ
جنگ آزادی کا ہیرو حریت کا بادشاہ
جس نے ان لمحوں میں خالق کا کیا سجدہ ادا
چہرہ جب سنولا گیا تھا آفتاب زیست کا

---

(۱) معاصر ادب کے پیش رو ڈاکٹر محمد حسن مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۸۲ء۔

چھاؤں میں تیغوں کی یکسر نہر بل کھاتی ہوئی

اک طرف پیاسو کے رونے کی صدا آتی ہوئی

سر پہ تیغ خوں چکاں سجدے میں خم فرق نیاز

ہم ہیں کیفی کیا نہ بھولے گا خدا بھی یہ نماز

کیفی نے ایک دوسری نظم میں حضرت امام حسین کو انقلابی ہیرو اور فاتح لیل ونہار کے طور پر پیش کیا ہے، چند اشعار دیکھئے:

حسین فاتح لیل ونہار بن کے رہا

حسین زیست کا اک شاہکار بن کے رہا

حسین آئینہ کردار بن کے رہا

ہزار اس کے ستانے پر تل گئی دنیا

ہزار اس کے مٹانے پر تل گئی دنیا

ضمیر دہر ے میں وہ یادگار بن کے رہا

اسی طرح حضرت امام زین العابدین کے متعلق کیفی نے ایک نظم میں امام کی مظلومی او رعب وجلال کی ملی جلی تصویر پیش کی ہے:

تیغ کو جنبش نہ تھی اور ہل رہی تھی کائنات

تھی زمانے سے جدا پکار زین العابدین

کیفی کی ان تمام نظموں کا وصف یہ ہے کہ ان کی مذہبی عقیدت مندیوں کے باوجود ان کی فکر انقلاب آشنا ہو کر ارتقا کے منازل طے کرتی ہوئی نظر آتی ہے، اس ارتقائے فکر کے اگلے قدم پر کیفی نے خود ساختہ مذہبی اجارہ داروں علماء اور نام نہاد رہبران ملت کی بے عمل زندگی کو نشانہ بنایا ہے، اس طرح نظم مولوی کا رجز وجود میں آئی ہے:

میں مجتہد عصر ہوں میں حاکم دیں ہوں
گھستا ہے جبیں خاک پہ کعبہ میرے آگے
تسبیح جپا کرتے ہیں مذہب میری خاطر
ایمان کیا کرتا ہے سجدہ میرے آگے
جو قوم اجل سے بھی لڑا سکتی ہے آنکھیں
اس قوم کا ہلتا ہے کلیجہ میرے آگے
بندے تری کوشش پہ ہنسی آتی ہے مجھ کو
جب زور خدا کا نہیں چلتا مرے آگے
یہ کفر کی ہے نقل کوئی کفر نہیں ہے
کیفی یوں ہی ارشاد ہوا تھا میرے آگے

کیفی علمائے دین اور رہبران ملت میں اپنے مثالی کرداروں کی صفات دیکھنے کے خواہش مند تھے لیکن جب ان کے قول وعمل میں تضاد پاتے ہیں تو ان سے الگ ہوکر مارکس لینن اور گاندھی وغیرہ سے یہ صفات حاصل کرتے ہیں۔ علماء کے قول وعمل کا یہ تضاد جب انہوں نے سلطان المدارس میں بہ چشم خود دیکھا کہ وہ بظاہر تو کچھ ہیں لیکن چھپ کر انقلابی اور باغی خیالات کی کتابیں بچوں سے پڑھوا کر سنا کرتے ہیں۔ اس کتاب پر یوپی سرکار نے پابندی عائد کر رکھی تھی۔ یہی کتاب کیفی کی ترقی پسند ادب سے وابستگی کی محرک ہے۔ لیکن برملا نہیں کہتے اور نہ ان کے کتابوں کے مطابق اپنا ایمان استوار کرتے چنانچہ وہ اس شعر کے مصداق:

مفتیان کیں جلوہ بر محراب ومنبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

وہ سلطان المدارس چھوڑ کر ان مولویوں سے کنارہ کش ہوگئے۔ غرض کہ کیفی نے اپنی تمام تر شاعری

کو انسانیت کی بقا اور استحصال کے خلاف احتجاج کا ذریعہ بنالیا۔ مگر ذہن وفکر کی ابتدائی نشو ونما مذہبی کردار ان کی شاعری کے تینوں ادوار میں ہمیشہ ان کے ذہن وشعور کو جلا بخشتے رہے۔ اس کی مثالیں ان کی پوری شاعری میں کسی نہ کسی پیرائے میں اشاروں یا علامتوں کے حوالے سے دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

کیفی کی نظموں کے اس مفصل جائزے سے یہ ادراک بہم پہونچتا ہے کہ کیفی کی شاعری رومانیت اور انقلاب سے امن عالم تک پھیلی ہوئی ہے، جس میں زندگی کی تلخیاں، محبت کا سوز وگداز، ظلم وتشدد کے خلاف احتجاج سماجی جدوجہد، انفرادی درد کرب غرضکہ سب ہی کچھ موجود ہے۔ اس طرح کیفی اعظمی نے اپنی فکر رسا کی تمام تر جہتوں اور فن کے وسیع ترین امکانات سے اردو شاعری کو صحت مند روایت دے کر مالا مال کیا ہے۔

کیفی کی ایک نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ دوسرا اجلاس ہے۔ یہ نظم اقبال کی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ کا نہ جواب ہے نہ اس میں اضافہ کی کوشش ہاں اقبال کی طرز پر ضرور تحریر کی گئی ہے۔ اقبال کی نظم ۱۹۳۶ء کی تخلیق ہے اور کیفی نے اپنی نظم ۱۹۸۳ء میں قلمبند کی۔ اس قریب نصف صدی کے فرق میں ملکی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات یکسر بدل چکے تھے۔ ۱۹۳۶ء ترقی پسند تحریک کا ابتدائی دور تھا اور آزادی کی جدوجہد اپنے شباب پر تھی ان تمام حالات اور پس منظر کے آئینہ میں اقبال نے جو دیکھا برتا اور محسوس کیا اس کو انہوں نے ابلیس اور اس کے مشیروں کو علامت کے طور پر استعمال کر کے اپنے تاثرات نظم کئے ہیں، جبکہ کیفی نے ملکی آزادی کے قریب ۳۶ سال گزر جانے کے بعد حالات کو مضمون بنایا ہے۔ صرف آزادی کے نام پر تنگ نظری، مفاد پرستی، عصبیت آپسی رنجشیں، رہنماؤں کے کھوکھلے وعدے اور بالخصوص مسلمانوں کی زبوں حالی اور مایوسیوں کا زمانہ کیفی کے سامنے تھا۔ ان تمام حالات کو اقبال کا رنگ وآہنگ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے محسوسات پیش کئے ہیں۔ کیفی نے نہایت دیانت دارانہ روش اپناتے ہوئے اپنے کل انتخاب کلام سرمایہ میں پہلے اقبال کی نظم لکھی اور اس کے بعد اپنی نظم درج کی ہے غالباً انہوں نے یہ اس لئے کیا کہ ان کی نظم کی تفہیم کے ضمن میں اقبال کی نظم آسانی فراہم کر سکتی ہے۔ اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' اور اس

کے پانچ مشیروں کے مابین مکالمے پر مبنی ہے، جس میں اس وقت کے سیاسی حالات اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے زوردار اثرات اور مسلمانوں کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اقبال نے ابلیس کے تیسرے مشیر کی زبانی کارل مارکس کی اہمیت کا اظہار کیا ہے۔

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب!
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب!
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیمے کی طناب!

کیفی کی نظم کا موضوع اشتراکیت اور عالم انسانیت ہے، اقبال اور کیفی کی نظموں سے بحث کرتے ہوئے علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''دراصل کیفی کی نظم اقبال کی نظم کا جواب نہیں، بلکہ ان امکانات کا اظہار ہے، جو اس تاریخی دور کے بطن میں پوشیدہ ہیں آج عالم اسلام اور اشتراکیت کے درمیان ایک نئی مفاہمت کی ضرورت ہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ سرمایہ داری ملوکیت کا خاتمہ صرف اشتراکیت کرے گی اور اسلام کی جمہوری اور انسانی روایات اس کا ساتھ دیں گی۔'' (۱)

کیفی کی نظم بھی اقبال کی نظم کی طرح پانچ مشیروں کی بات چیت پر مبنی ہے وہ دور کے نئے تقاضوں اور معترضین کے جواب کے طور پر لکھی گئی ہے کیفی نے کمیونسٹ پارٹی کے بٹ جانے سے اسے زیادہ وسیع ہونے کے امکانات کا ذکر کیا ہے۔ کیفی کے اس نقطہ نظر کے تعلق سے محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

''انہوں نے اپنی طویل نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ دوسرا اجلاس میں حقیقی جمہوری

---

(۱) پیش لفظ ابلیس کی مجلس شوریٰ دوسرا اجلاس۔ کیفی اعظمی۔ کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ ص ۲۷۷۔

اقدار کی وکالت کی ہے، اگر اشتراکیت سے جمہوری اقدار منہا کردی جائیں تو یہ شرف انسانیت کے اسی قدر خلاف ہوگا، جس طرح سرمایہ دارانہ جمہوریت سے معاشی مساوات اور عدل کی مفقود الخبری انسانیت کے ساتھ مذاق کا درجہ رکھتی ہے۔"(۱)

کیفی کی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ دوسرا اجلاس سے یہ بند ملاحظہ کیجئے:

روس اک کوہ حقیقت ہے بساط ارض پر
ریزہ ریزہ ہوگیا ٹکرا کے جس سے تیرا خواب
اپنے پر چنتا ہے اپنی خوں چکاں منقار میں
تلملا کر روس پر جھپٹا تھا جو فاشی عقاب

تیرے مشیر کی بات سن کر ابلیس غصے میں لال ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

روس سے دست و گریباں ماوواد ی چین ہے
ولگا سے بدگماں پولینڈ کی ہے آب جو
ہورہا ہے آئے دن تازہ تضادوں کا ظہور
ہے زوال آمادہ لینن کا جہان آرزو

اب پانچواں مشیر ابلیس سے کہتا ہے:

یہ تضادوں کا تصادم ہے ترقی کی دلیل
اپنی نافہمی سے سمجھا ہے جسے بحران تو
پہلے تنہا روس تھا اب اس کے ساتھی ہیں کئی
اور ہر ساتھی کو اپنی راہ کی ہے جستجو

سیاسی اعتبار سے یہ نظم کامیاب نہیں ہے کیونکہ تھوڑے ہی دنوں بعد رونما ہونے والے واقعات نے اس کی کئی پیشین گوئیوں کو کالعدم ٹھہرا دیا ہے۔ نظم "چھ دسمبر" کو کیفی نے اس موضوع پر لکھا ہے، جس کا تعلق

(۱) کیفی اعظمی: شاعری اور آدرش محمد علی صدیقی مشمولہ کیفی اعظمی فن اور شخصیت ص ۱۲۴ معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء

قومی یک جہتی سے ہے۔ انہوں نے فرقہ وارانہ ذہنیت کو ہمیشہ ہدف ملامت بنایا۔ وہ قومی یک جہتی پر یقین رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے قلم سے ہر ہر طرح سے اسے تقویت دینے کی کوشش کی ہے۔ ۶/دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد کو مسمار کر کے رام مندر بنانے کے منصوبے کا واقعہ زبردست منافرت اور فرقہ وارانہ فسادات کا موجب ہے۔ آج حال یہ ہے کہ دونوں فریق اسے اپنی حیات وموت عزت وتوہین کا مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ اس نظم میں کیفی نے نہایت فنکارانہ ڈھنگ اپناتے ہوئے مسجد ڈھانے والوں سے اپنی زبان سے کچھ کہنے کے بجائے انہوں نے سری رام چندر جی کی زبانی وہ سب کچھ کہہ دیا ہے، جو قومی یک جہتی پسند دل کی آواز ہے، نظم ملاحظہ ہو:

رام بن باس سے جب لوٹ کے گھر میں آئے
یاد جنگل بہت آیا جو نگر میں آئے
رقص دیوانگی آنگن میں جو دیکھا ہوگا
چھ دسمبر کو سری رام نے سوچا ہوگا
اتنے دیوانے کہاں سے میرے گھر میں آئے
دھرم کیا ان کا ہے کیا ذات ہے یہ جانتا کون
گھر نہ جلتا تو انہیں رات میں پہچانتا کون
گھر جلانے کو مرے لوگ جو گھر میں آئے
شاکاہاری ہیں مرے دوست تمہارے خنجر
تم نے باہر کی طرف پھینکے تھے سارے پتھر
ہے میرے سر کی خطا زخم جو سر میں آئے
پاؤں سرجو میں ابھی رام نے دھوئے بھی نہ تھے
کہ نظر آئے وہاں خون کے گہرے دھبے

پاؤں دھوئے بنا سرجو کے کنارے سے اٹھے

رام یہ کہتے ہوئے اپنے دوارے سے اٹھے

راج دھانی کی فضا آئی نہیں راس مجھے

چھ دسمبر کو ملا دوسرا بن باس مجھے

کیفی کی صرف اسی نظم کے جائزے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ کیفی کی شاعری رومانیت سے انقلاب اور انقلاب سے بڑھ کر امن عالم تک کو محیط ہے۔ ان کی نظموں میں محبت کا سوز وگداز زندگی کے حقائق اور تلخیاں، ظلم استبداد کے خلاف احتجاج، سماجی جدوجہد انفرادی دردوکرب سبھی کچھ موجود ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کیفی نے اپنے فکروفن کے سرچشموں سے نہ صرف یہ کہ اردو شاعری کو مالا مال کیا بلکہ کشت انسانیت اخوت اور بھائی چارگی کی خاطر خواہ آبیاری کی اور اسے پروان چڑھانے کی سعی مستحسن کی ہے۔

باب چہارم

دیگر اصناف سخن پر طبع آزمائی

غزل

غزل کو اردو کی مشہور ترین صنف شاعری کا درجہ حاصل ہے۔زبان اردو کا نام آتے ہی اس کی شاعری تصور میں آ جاتی ہے اور شاعری کا ذکر چھیڑتے ہی غزل اپنے پورے حسن و جمال، رعنائیوں و دلآویزیوں او رخوبیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ غزل شروع سے ہی اردو شاعری کا رتاج بنی رہی یعنی قالب کو اگر شاعری تو غزل کو روح تسلیم کیا جا تا رہا ہے۔

غزل کا فن اشارہ کنایہ، رمز و ایماء، تشبیہ و استعارہ، مجاز و تمثیل اور نغمگی اور آہنگ سے مزین و مرصع ہوتا ہے۔ابتدا ہی سے غزل میں حکایت بایار گفتن کے دوش بدوش حیات و کائنات کے تاریخی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تمدنی کوائف کی ترجمانی ہوتی رہی ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غزل کا ہر شعر اپنے اندر معنیٰ کی ایک بسیط دنیا سجائے ہوئے ہوتا ہے۔اس نے بہاروں کو سدا بہار میں رنگ دیا ہے تو پت جھڑوں میں پھول کھلائے ہیں۔اس نے اپنی خوشبو سے اگر ہواؤں کو معطر کیا ہے تو فضاؤں میں نغمے بکھیرے ہیں۔بقول رشید احمد صدیقی:

''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔''(۱)

فراق نے کہا:

''غزل انتہاؤں کا سلسلہ ہے۔''

---

(۱) جدید غزل از رشید احمد صدیقی مطبوعہ بار اول ۱۹۵۵ء ص ۳۔

حسرت موہانی کے مطابق:

"غزل کی بہترین قسم عاشقانہ ہے۔"

آل احمد سرور کا یہ شعری اظہار خیال:

غزل میں ذات بھی ہے او رکائنات بھی ہے
تمہاری بات بھی ہے اور ہماری بات بھی ہے
سرور اس کے اشارے داستانوں پر بھی بھاری ہیں
غزل میں جو میرا رباب فن کی آزمائش ہے

جگت موہن لال رواں اناوی کے جذبات دل اس طرح امنڈ آئے کہ:

اللہ اللہ یہ ہے وسعت دامان غزل
بلبل وگل پہ ہی موقوف نہیں شان غزل
ختم پنہائے دو عالم پہ پیایان غزل
پوچھئے حافظ شیراز سے امکان غزل
ضبط ہے آئینہ راز حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

غزل اپنی ابتدا تا انتہاء جس میدان میں آئی اور اس نے جو کردار ادا کیا اس کا مسکن اس کی تاریخی ارتقاء میں صاف نظر آتا ہے۔ دراصل ۱۸ ویں اور ۱۱ ویں صدی کا زمانہ غزل کیلئے ایک یادگاری حیثیت کا حامل عہد ہے، جس میں اس کے حسن کو شباب پر پہنچانے والی ہستیاں موجود تھیں، جنہوں نے ایسے شاعرانہ انداز فکر وکارنامے سے اسے چار چاند لگایا لیکن انہیں ادوار میں لطافت کے ساتھ کثافت کی آمیزش اس قدر بڑھی کہ اس کا حلیہ بگاڑا جانے لگا اور غزل گویوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ آبروئے شیوۂ اہل ونظر خطرے میں پڑ گئی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کا دور آ گیا اور حالات کے تقاضے بدلے زندگی کا نقطہ نظر اور فلسفہ حیات انسانی اور اس کے مطالبوں پر

نئے سرے سے غور کیا جانے لگا۔ سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ سماجی تبدیلیوں پر نئے اثرات کا پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ نئے انقلابوں اور جدید خیالوں سے انسان کی سماجی زندگی دوچار ہونے لگی اور ایک نئی قوم اپنے معاشرت کی خصوصیات کے ساتھ ہندوستان میں جب وارد ہوئی تو حالات کے کروٹ بدلتے ہی جہاں زندگی متاثر ہوئی ادب پر بھی اثر پڑا۔ غزل بھی ان حالات کی زد میں آئی تو جہاں ایک طرف غزل کی جگہ نظم کی طرف اٹھنے لگا وہاں غزل کے خلاف علم بغاوت بھی بلند ہونا شروع ہوا اور ایسے عالم میں غزل کی اصلاح کیلئے سب سے پہلے جس مصلح نے آواز اٹھائی وہ مولانا الطاف حسین حالی تھے۔ ان کا مقصد غزل کی مخالفت بالکل نہ تھا پر وہ تو صرف اس میں اصلاح چاہتے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے مطابق:

> ''مولانا حالی نے غزل پر جو نکتہ چینی کی وہ اصلاحی محرک کے تحت تھی نہ کہ ادبی مقاصد کے تحت انہیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے عشق، عقل اور ادراک کو خراب کر دینے والی چیز ہے۔ اس سے جتنا بھی اجتناب کیا جائے اتنا ہی قومی مصالح کی ترقی کا موجب ہوگا۔''(۱)

اگر حالی کو مقدمہ شعر و شاعری کی اشاعت کے بعد بہت کچھ مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن ان کے انقلابی و اصلاحی قدم نے غزل کی اندرونی و بیرونی فضاؤں کو بدلا اور اس کے ایک نئے تعمیری دور کا آغاز ہوا۔ میرؔ، سوداؔ، آتشؔ، غالبؔ، مومنؔ، اور ناسخؔ وغیرہ کی قدریں از سر نو متعین کی گئیں اور اسی کے زیر اثر فانیؔ، اصغرؔ، حسرتؔ اور جگرؔ نے جہاں اس کی آبرو کو بچایا وہاں اقبال کی غزل نے اس میں ایک نئی معنویت نیا وزن وقار اور نیا رنگ و آہنگ عطا کر حالی کی اصلاحی تحریک کو تقویت پہنچائی۔

مولانا حالیؔ کے بعد جن دوسرے لوگوں نے غزل کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا ان میں عظمت اللہ خاں اور کلیم الدین احمد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عظمت اللہ نے مشورہ دیا کہ غزل کی گردن بے تکلف اڑا دینی چاہئے، کلیم الدین احمد نے اسے ''ایک نیم وحشی صنف سخن کہا ہے۔''

---

(۱) اردو غزل۔ یوسف حسین خاں ص ۱۶۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادبی تحریک منظر عام پر آئی اور اس نے پوری اردو شاعری پر اپنے اثرات مرتب کئے۔ غزل بھی اس سے کافی متاثر ہوئی۔ حالانکہ ترقی پسندوں کے ایک طبقے نے ایک سرے سے غزل کی مخالفت کی، جس سے ترقی پسند حلقوں میں اس صنف کی افادیت موضوع بحث بن گئی۔ باوجود اس کے اکثر ترقی پسند شعراء غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی شعری کاوشوں نے صنف غزل کو ایک نئی فکر اور نیا مزاج عطا کیا۔

بقول علی سردار جعفری:

> ''بعض ترقی پسندوں نے غزل کی صنف کو غیر جمہوری اور بیکار قرار دے دیا اس رجحان کی امامت شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے کی.......... حضرت جگر مراد آبادی نے جب ۱۹۳۹ء-۱۹۴۰ء میں اپنی ایک غزل میں ترقی پسندوں کے خلوص اور نیت پر حملہ کیا اور انہیں ''قوم وطن کا بت پرست'' قرار دیا اور اس کے بعد مرزا یگانہ چنگیزی نے غزل کے سوا کئی اور صنف کو شاعری ماننے سے انکار کر دیا اور ترقی پسند ادیبوں اور ادب کیلئے انتہائی غیر ادبی زبان استعمال کی تو غزل کی مخالفت کے رجحان نے اور زور پکڑ لیا۔ لیکن اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہئے کہ جس طرح ماضی کی روایات کے سلسلے میں ترقی پسندوں نے مجموعی طور سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں لیا تھا اسی طرح غزل کی مخالفت بھی ترقی پسند تحریک کا پروگرام نہیں بنی۔ غزل موضوع بحث رہی اور ''نیا ادب'' اور دوسرے ترقی پسند رسائل کے صفحات پر غزل کی مخالفت اور موافقت میں مضامین شائع ہوتے رہے یہی وجہ ہے کہ غزل پر بحث بھی ہو رہی تھی اور ترقی پسند غزل بھی کہی جا رہی تھی۔ (۱)

اگرچہ بہت سے ترقی پسند شاعروں نے غزلیں کہیں لیکن ان میں مجروحؔ سلطانپوری ایسے ترقی پسند شاعر تھے، جنہوں نے صرف اور صرف غزل کو ہی اپنی شاعری کی جولانگاہ اور اپنے مجموعہ کا نام ہی ''غزل'' لکھا۔ بقول قاضی عبدالغفار:

---

(۱) سردار جعفری ترقی پسند ادب مطبوعہ دوم ۱۹۵۷ء ص ۲۲۰۔

''غزل کے میدان میں انہوں نے وہ سب کچھ کہا ہے، جس کیلئے بعض ترقی پسند شعراء صرف نظم کا پیرایہ ضروری اور ناگزیر سمجھتے ہیں۔ صحیح طور پر انہوں نے غزل کے سینے میں ایک نئی شراب بھردی ہے۔''(۱)

کیفی نے حالانکہ کم غزلیں لکھی ہیں لیکن اپنی غزلوں میں جن خیالات کا اظہار قلمبند کیا، وہ ترقی پسند شاعری کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں اور سیکولر نقطہ نظر کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی برجستہ اظہار ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے وابستگی رکھنے والوں میں جن دوسرے مشہور شاعروں نے اعلیٰ درجے کی نظمیں کہنے کے ساتھ ساتھ صنف غزل میں قابل قدر اضافے کئے ہیں ان میں مجازؔ، سردار جعفریؔ، غلام ربانی تاباںؔ، ساحرؔ، جاں نثار اختر اور کیفی اعظمی کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

غزل کی اصلاح کا رجحان مولانا حالی سے شروع ہوا لیکن یہ صرف موضوعات کی حد تک تھا۔ اس کے بعد وحید الدین سلیم، جوش ملیح آبادی وغیرہ کے وہ اسماء ہیں، جو غزل کی ساخت کے ہی خلاف تھے ان کے خیال کے مطابق یہ بے وقت کی راگنی سے زیادہ وقیع نہیں اور بقول کلیم الدین احمد نیم وحشیانہ شاعری ربط و تسلسل سے عاری کلام ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہر صاحب کا یہ نظریہ انتہا پسندانہ ردعمل ہی کہا جائے گا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بلا شبہ نہایت نپی تلی اور متوازن رائے غزل کے متعلق یہ دی ہے:

''غزل کی مقبولیت سے کچھ لوگ اسی حقیقت سے چشم پوشی کرنے لگے ہیں کہ غزل ساری شاعری نہیں ہے اور نہ غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہہ کر دل خوش کر لینا مناسب ہے۔''......غزل ہماری شاعری کی ایک اہم اور قابل قدر صنف ہے اور ہر دور میں زندگی کے حقائق کی عکاسی اپنے مخصوص انداز اور اسلوب میں کرتی رہی ہے۔ اسی اسلوب کو تغزل کہا گیا ہے۔(۲)

---

(۱) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی مارچ ص ۷۷، ۱۹۷۲ء۔

(۲) اردو غزل مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی۔ مشمولہ مضمون ''غزل کا فن'' آل احمد سرور اردو اکادمی دہلی ص ۲۳، ۲۰۰۱ء

شروع میں ترقی پسند شاعروں نے غزل کو درخور اعتناء نہیں سمجھا اور جب اسے اپنایا تو اردو غزل کی عام روایت سے دامن بچاتے ہوئے چنانچہ اس طرح اس کا بنیادی مفہوم حکایت با یار گفتن اس کے بنیادی کردار عاشق و معشوق اور رقیب وغیرہ معنوی اعتبار سے بالکل بدلے ہوئے تھے اور ایہام و اختصار کے بجائے وضاحت ضروری سمجھی گئی تھی ترقی پسندی کے اصول کے تحت ترقی پسند شاعر کے لئے طے شدہ نتائج کو نظم کرنا ضروری تھا۔ اس لئے اس میں مقصد کو اولیت اور فن کو ثانویت حاصل ہوئی اس کی وجہ سے بیشتر ترقی پسند غزل محض خطابت اور بیان بن کر رہ گئی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہے کہ کچھ ترقی پسند شعراء نے اچھی غزلیں بھی کہی ہیں۔ اسی زمانہ ترقی پسندی میں فیض کی غزلیں ان کی نظموں سے زیادہ مقبول ہوئیں معین احسن جذبی، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، مخدوم، وامق، پرویز شاہدی، تاباں ساحر اور اختر انصاری وغیرہ نے ترقی پسند خیالات کی عکاسی اپنی غزلوں میں کی ہے۔

اختر انصاری کے مطابق:

> ''یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہی اردو غزل جو تین سو سال تک جاگیردارانہ تصورات کی عکاس بنی رہی، آج بڑی کامیابی کے ساتھ بیسویں صدی کے تمدنی بحران اور تہذیبی خلفشار کو اپنی مخصوص رمزیت وایمائیت کے دامن میں سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے اور ہمیشہ کی طرح لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو یکساں طور پر مسحر و مسخور کئے ہوئے ہے۔(۱)

کیفی اعظمی اپنی کچھ غزلوں کی وجہ سے ترقی پسند غزل گو شعراء کی صف میں شامل ہیں۔ حالانکہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں پھر بھی انہوں نے عام روایت کے مطابق اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی ہے۔ خود کیفی کے قول کے مطابق یہ ان کی پہلی غزل ہے وہ لکھتے ہیں ''یہ میری زندگی کی پہلی غزل ہے جو میں نے گیارہ برس کی عمر میں کہی تھی۔''(۲)

---

(۱) غزل اور درس غزل۔ منظر انصاری ص ۱۰۔

(۲) میں اور میری شاعری سرمایہ دیباچہ محررہ کیفی اعظمی ص ۱۷۔

وہ غزل یہ ہے:

اتنا تو زندگی میں کسی کے خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے
ساقی سبھی کو ہے غم تشنہ لبی مگر
مے ہے اسی کے نام پہ جس کے ابل پڑے
مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہوگیا مگر آنسو نکل پڑے

افسوسناک امر یہ ہے کہ کیفی کا ابتدائی کلام زیادہ تر ضائع ہوگیا ہے۔ یہ غزل اس لئے بچ گئی کہ اسے بیگم اختر نے اسے اپنی آواز دیکر جاوداں بنادیا ہے۔ حالانکہ یہ غزل پوری طرح روایت سے ہٹ کر نہیں ہے۔ لیکن کیفی کی قادرالکلامی کا پتہ ضرور دیتی ہے۔ کیفی نے بیشتر طور پر اپنی بات عوام تک پہونچانے کے لئے نظم ہی کو وسیلہ ٹھہرایا پھر بھی انہوں نے غزل کی بھی مشاطگی کی۔ ان کا رجحان یقیناً نظم گوئی کی طرف زیادہ رہنے کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اپنی بات عوام تک تفصیل سے پہونچانا چاہتے تھے اور اس کام کیلئے نظم ہی مناسب صنف ہوسکتی ہے۔ غزل اختصار کا فن ہے اشاروں کنایوں میں بات کہنا اس کا حق تفصیل ووضاحت کی یہ متحمل نہیں اور تاثر کھو بیٹھتی تھی۔ نظم میں تفصیلات کے امکان ہی امکان ہیں۔ کیفی نے غزلیں بہت کم کہی ہیں، جن کی مجموعی تعداد کم وبیش پچاس ہوسکتی ہے۔ لیکن غزل کے انتخاب کے سلسلے میں انہوں نے سخت رویہ اپنایا اور حد یہ کہ کل انتخاب سرمایہ میں صرف گیارہ غزلوں کو جگہ دی ہے ان کی

پوری غزلیہ شاعری کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پہلے دور کی غزلیں رومانی اور سبک ہیں نغمگی اور ترنم سے بھرپور ہیں ان کے مصرعوں میں روانی بے ساختگی اور رس ہے کہ ان کا قاری ایک سحرزدہ کیف میں شرابور ہو جاتا ہے مثلاً:

بس اک جھجک ہے یہی حال دل سنانے میں
کہ تیرا ذکر بھی آئے گا اس فسانے میں
یہ کہہ کے ٹوٹ گیا شاخ گل سے آخری پھول
اب اور دیر ہے کتنی بہار آنے میں

کیفی کی ابتدائی غزلوں میں آثر آفرینی کی ایک وجہ ان کی زبان کی سادگی اور جذبے کی سچائی ہے۔

تمہیں نے دل کو دل سمجھا نہیں ہے
کوئی ارماں نہ ہو ایسا نہیں ہے
میرے سینے میں اپنا درد بھردو
اکیلے بوجھ یہ اٹھتا نہیں ہے

دوسرے دور میں کیفی نے صرف نظمیں ہی کہی ہیں جو ان کے دوسرے مجموعہ کلام ''آخرشب'' میں شامل ہیں۔ ''آخرشب'' میں کوئی غزل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک ترقی پسند منشور کے تحت شعراء کیلئے غزل کہنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اس بارے میں یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک پر چونکہ اشتراکیت کا نشہ سوار تھا، اس لئے اس کے ذمہ داروں نے جب یہ محسوس کیا کہ غزل ان کی اشتہاری مہم کا آلہ کار بننے سے انکار کر رہی ہے تو اشتراکی اصولوں کے تحت انہوں نے فوراً اس کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔''(۱)

اور جب اشتراکی تحریکیں سرد پڑ گئیں اور پوری دنیا میں اشتراکی تحریک کے افتراق نے نئی صورت حال

---

(۱) ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری ۲۷۶ یعقوب یاور ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۷ء۔

سامنے کردی تو ایک مدت مدید تک کیفی پر خاموشی چھائی رہی اور جب سکوت ٹوٹا تو اب ان کی شاعری کا لب ولہجہ اور آہنگ بدل چکا تھا۔ یہ لہجہ کیفی کے تیسرے دور کی شاعری کی پہچان ہے یہی کیفی کی شاعری کا اصل رنگ بھی ہے۔ یہاں کیفی کا اسلوب بالکل بدلا ہوا نظر آتا ہے۔

اسی طرح آوارہ سجدے کی نظموں اور غزلوں میں کیفی اپنے فن کمال پر نظر آتے ہیں اوارہ سجدے کی غزلیں اپنے ترقی پسند معیار پر پوری اترتی ہیں، جو کیفی کے پختہ شعور کو اک جامع اظہار فراہم کرتی ہیں اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح کیفی اعظمی کی غزلوں میں بھی عصری زندگی کے مسائل نظر آتے ہیں اور ان کی شاعری میں ان کی شخصیت کا عکس اور زندگی کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ کیفی مجواں کے رہنے والے تھے اس لئے گاؤں کی زندگی اور گاؤں والوں سے انہیں بے حد لگاؤ اور محبت ہے ان کے بچپن کی یادیں گاؤں سے جڑی ہیں جس کا ذکر انہوں نے اپنی غزلوں میں بھی کیا ہے۔

میرا بچپن بھی ساتھ لے آیا
گاؤں سے جب بھی آ گیا کوئی

چنانچہ گاؤں چھوڑنے کے بعد وہ پچھتاتے ہیں:

غربت کی ٹھنڈی چھاؤں میں یاد آئی اس کی دھوپ
قدر وطن ہوئی ہمیں ترک وطن کے بعد

کیفی نے آنکھ کھول کر گاؤں دیکھا سن شعور کو پہونچنے تک اس کا بھرپور جائزہ لیا اس لئے وہ گاؤں کی مشکلات سے واقف ہیں کسانوں اور مزدوروں بے روزگاری اور ان کی بھوک کیفی کا سکون چھین لیتی ہے۔

وہ میرا گاؤں ہے وہ میرے گاؤں کے چولھے
کہ جن مین شعلے تو شعلے دھواں نہیں ملتا

قحط اور سیلاب جو کسانوں اور دیہاتوں کی ایک عام پریشانی ہے اس کے متعلق کیفی کے یہ اشعار دیکھئے:

کیا جانے کس کی پیاس بجھانے کدھر گئیں
اس سر پہ جھوم کے جو گھٹائیں گذر گئیں
دیوانہ پوچھتا ہے یہ لہروں سے بار بار
کچھ بستیاں یہاں تھیں بتاؤ کدھر گئیں

شہر کی عام زندگی اور اس کے مسائل کیفی کی غزلوں کا خاصہ ہیں:

لگ گیا اک مشین میں میں بھی
شہر میں لے کے آ گیا کوئی
میں کھڑا تھا کہ پیٹھ پر میری
اشتہار اک لگا گیا کوئی

ہر دور میں انسان کو ایک انسان کی جستجو رہی ہے کیفی کو جس طرح کا انسان چاہئے وہ اس کی تفصیل نہ بیان کر کے اس کی تعریف نئے بشر کے طور پر کرتے ہیں:

نئی زمین نیا آسماں بھی مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشان مل جائے

اور اس نئے بشر کی تلاش سے تھک کر وہ حراساں نہیں ہوتے بلکہ اپنی امیدوں کا دیا ہمیشہ روشن رکھتے ہیں:

خار و خس تو اٹھیں راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے

کیفی کا یہ انداز بھی دیکھئے کہ مزدوروں کو آواز دیتے ہیں کہ خود کو پانے کیلئے زمین کی تہیں کھولو وقت کی ضرورت اور تقاضہ ہے کہ ہم اپنی ذات کو پہچانیں:

بیلچے لاؤ کھولو زمین کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

یہ تاریخی المیہ ہے کہ ہر زمانے میں فرقہ پرست اور ظلم پرست افراد (طاقتوں) نے ترقی کی راہوں میں کانٹے بچھائے ہیں اور کچھ حق شناسوں نے ان کی حرکات قبیحہ پر تیشہ زنی کی اور انہیں پسپا کیا ہے۔ اس سچائی نے کیفی کی شاعری میں مایوسی اور نامرادی کی جگہ حرارت اعتماد اور رجائیت بھر دی ہے:

اعلان حق میں خطرۂ دار و رسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد
جرم ہے تیری گلی سے سر جھکا کر لوٹنا
کفر ہے پتھراؤ سے گھبرانا تیرے شہر میں

کیفی اس قسم کے تصورات سے فکری سطح پر جنگ کرتے ہیں، جو گمراہ کرنے والے ہوں اور جو ہم میں پست ہمتی پیدا کرتے ہوں۔

چاند سورج بزرگوں کے نقش قدم
خیر بجھنے دو ان کو ہوا تو چلے
ہے آج زمین کا غسل صحت
جس دل میں ہو جتنا خون لائے

بنیادی طور سے کیفی نظم نگار ہیں اس لئے ان کی غزلوں میں بھی نظم کی ہلکی تھرتھراہٹ محسوس ہوتی ہے پھر بھی ان کی غزلیں ایک تخلیقی شعور کو ایک جامع اظہار فراہم کرتی ہیں ان کا وصف یہ ہے کہ ترقی پسند غزل گو شعراء کی صف میں وہ اپنی چند نہایت اہم غزلوں کی وجہ سے ایک منفرد مقام بنا چکے ہیں ان کی غزلوں میں تیکھا پن، عصری آگہی عصری حسیت اور حقیقت پسندی کے ساتھ رومانی روایت پسندی موجود ہے ان کی متعدد غزلیں اپنے داخلی تاثر حسن اور وقار کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔

زمیں نے بوجھ اٹھایا نہ جانے کس کس کا
رہا جو نقش قدم تو کسی کسی کا رہا

انساں کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں
دو گز زمیں بھی چاہئے دو گز کفن کے بعد

......☆☆☆......

دستور کیا یہ شہر ستمگر کے ہوگئے
جو سر اٹھا کے چلتے تھے بے سر ہوگئے

......☆☆☆......

دل میں کوئی صنم ہی بچا نہ خدا رہا
اس شہر پر وہ ظلم بھی لشکر کے ہوگئے

......☆☆☆......

ایسا لگا غریبی کی ریکھا سے ہوں بلند
پوچھا کسی نے حال کچھ ایسی ادا کے ساتھ

......☆☆☆......

گر ڈوبنا ہی اپنا مقدر ہے تو سنو
ڈوبیں گے ہم ضرور مگر ناخدا کے ساتھ

......☆☆☆......

اس کو مذہب کہو یا سیاست کہو
خودکشی کا ہنر تم سکھا تو چلے

......☆☆☆......

جو اک خدا نہیں ملتا تو اتنا ماتم کیوں
مجھے خود اپنے قدم کا نشاں نہیں ملتا

......☆☆☆......

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا

......☆☆☆......

جب سر ڈھکا تو پاؤں کھلا پھر یہ سر کھلا
ٹکڑے اسی میں پرکھوں کی چادر کے ہو گئے

......☆☆☆......

رشک آئے کیوں نہ غالب کے مقدر پر مجھے
جانے کتنی مشکلیں تھیں وہ جو آساں ہو گئیں

......☆☆☆......

اکیسویں صدی کی طرف ہم چلے تو ہیں
فتنے بھی جاگ اٹھے ہیں آواز پا کے ساتھ

......☆☆☆......

پایا بھی ان کو کھو بھی دیا چپ بھی ہو رہے
اک مختصر سی رات میں صدیاں گزر گئیں

......☆☆☆......

بہار آئے تو میرا سلام کہہ دینا
مجھے تو آج طلب کرلیا ہے صحرا نے

مجموعی طور پر کیفی کی غزلیں تجربات پر مبنی ہیں، جن میں عصری سچائیوں کی گہری نشتریت، حیات آفریں جہد حیات اک پختہ تخلیقی شعور اور ساتھ میں نظمیہ شاعری کے اثرات موجود ہیں۔ انہوں نے شعوری طور پر عہد

حاضر کے شعور واحساس کو نئے معنیاتی نظام سے کچھ ایسا ہم آہنگ کیا ہے کہ غزل کے مختصر ترین سرمایے کے باوجود ترقی پسند غزل گوشعرا کی صف میں ان کے نام کی شمولیت لازم ہوگئی ہے۔

مثنوی خانہ جنگی

مثنوی غزل کے بعد اردو شاعری کی سب سے اہم صنف سخن ہے، ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق:

''غزل کے علاوہ بقیہ اصناف میں مثنوی کی اہمیت مسلم ہے۔''(۱)

اس صنف میں اردو شاعری کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے، بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

''غزل کے بعد ہمارے شاعروں نے جس صنف سخن پر سب سے زیادہ طبق آزمائی کی ہے وہ مثنوی ہے۔''(۲)

ہیئت کے اعتبار سے مثنوی ایک ایسی اصطلاح ہے، جس کا دائرہ انتہائی وسیع ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تعریف ڈاکٹر گیان چند جین کے الفاظ میں۔

''مثنوی نظم کا وہ پیکر ہے، جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں لیکن ہر شعر کے بعد قافیہ بدلتا جائے، دو دو ہم قافیہ مصرعوں کی رعایت سے اس کا نام مثنوی طے پایا کیونکہ مثنوی کے معنی دو دو کیا گیا۔''(۳)

مثنوی اردو شاعری کی ایسی صنف سخن ہے، جس میں منظوم قصے ایک مخصوص شعری ہیئت میں پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ بقول فضل امام رضوی:

---

(۱)''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' ڈاکٹر گیان چند جین مطبوعہ ۱۹۶۹ء ص ۱۶۷۔

(۲) ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مطبوعہ جنوری ص ۷، ۱۹۶۲ء۔

(۳)''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' ڈاکٹر گیان چند جین مطبوعہ ۱۹۶۹ء ص ۵۵۔

''مثنوی کا اصل تصور یہ ہے کہ وہ طویل ہو اور اس میں قصہ پن پایا جاتا ہو۔''(۱)

۱۸۷۴ء میں جدید شاعری کے ظہور کے بعد کچھ دنوں تک اردو میں طویل داستانی مثنویاں لکھنے کا رواج باقی رہا اور شوق قدوائی جیسے شعراء جدید شاعری سے متاثر ہونے کے باوجود ''ترانۂ شوق'' جیسی مثنوی لکھتے رہے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا اور بالآخر جدید شاعری کی بہار صنف مثنوی کے حق میں خزاں بن گئی۔ مثنوی کی ہیئت تو اس کے بعد بھی زندہ رہی اور نہ صرف یہ کہ آزاد حالی نے اس ہیئت کو متعدد شعری تخلیقات میں اپنایا عہد حاضر کے کئی شعراء کے کلام میں بھی مثنوی کی ہیئت کو برتنے اور استعمال کرنے کی مثالیں مل جاتی ہیں مگر مثنوی کی ہیئت کے زندہ رہنے سے مثنوی کی صنف زندہ نہ رہ سکی۔ جدید شعراء نے اس ہیئت میں جو شعری نمونے تخلیق کئے ہیں وہ مثنویاں نہیں بلکہ نظمیں ہیں۔ جدید شاعری کے فروغ کے بعد مثنوی ایک علاحدہ صنف سخن کی حیثیت سے ختم ہو گئی اور اس کا وجود نظم میں ضم ہو گیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مندرجہ ذیل جملوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے:

''رومانی داستانی مثنویوں کا شباب ڈھلنے پر دراصل مثنوی بحیثیت صنف سخن ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے بعد جو مثنویاں وجود میں آئیں ان کو مثنوی کے بجائے نظم کہنا زیادہ مناسب ہو گا کیونکہ دور جدید میں مثنوی نے اپنی انفرادیت کھو دی۔(۲)

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جہاں زندگی اور ادب کے تمام شعبوں میں نمایاں تبدیلی کا احساس اور اظہار ہوا۔ اردو مثنوی کے موضوعات میں بھی نمایاں تبدیلی آئی۔ زندگی بدلی، رویے بدلے، تصورات بدلے، حقیقت پسندی اور مادہ پرستی میں اضافے ہوے۔ سماجی اور سیاسی شعور میں تبدیلی آئی، زندگی بدلی اور غزل اور نظم بھی بدلی ان خوشگوار اور ناخوشگوار تبدیلیوں نے جہاں فن کاروں کا ایک گروپ کلاسیکی صنف سخن سے بیزار ہوا تو کچھ

---

(۱) ڈاکٹر فضل امام۔ امیر اللہ تسلیم حیات اور شاعری شاعت اول ۱۹۷۴ء ص ۱۱۹۔

(۲) اردو مثنوی شمالی ہند میں از ڈاکٹر گیان چند جین مطبوعہ ۱۹۶۹ء ص ۶۸۶۔

روایت پسندوں نے مثنوی کو تخلیقی اظہار کا موثر ذریعہ تسلیم کیا۔ چنانچہ اس دور کے جتنے بھی سربرآوردہ شاعر ہیں سبھی نے نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ مثنویاں بھی کہیں اور ایک نئے انداز اور مزاج کے ساتھ کہ جس نے اردو مثنوی کا معیار اور مذاق ہی بدل دیا۔ آزاد، شبلی، اسماعیل میرٹھی، حالی، اقبال وغیرہ نے مثنویاں کہیں۔ حالی کی مثنوی ''حب وطن'' جذبہ وطن سے سرشار ہے یہ مثنوی اس وقت لکھی گئی، جب ملک میں آزادی کی لہر تیز ہو چکی تھی۔ حالی اس مثنوی کے اخیر میں کہتے ہیں:

ملک روندے گئے ہیں پیروں سے
چین کس کو ملا ہے غیروں سے
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
قوم حب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹی

اقبال نے ''ساقی نامہ'' لکھ کر اردو مثنوی کو ایک فکر، جہت اور جدت عطا کی۔ بقول پروفیسر محمد عقیل:

''ساقی نامہ، ذوق، جدت، رجائیت اور خودی کے مختلف کارناموں کا مجموعہ ہے۔''(۱)

اس مثنوی کا مطالعہ جہاں فکر و خیال کی نئی منزلیں طے کرتا ہے وہیں جوش عمل کو دعوت بھی دیتا ہے:

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسم زبان و مکاں توڑ کر
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسمان اس کا صید

(۱) اردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں — سید محمد عقیل رضوی اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ص ۲۸۲۔

اقبال نے اس مثنوی میں زندگی اور موت، حیات وکائنات کے فلسفے کو جس طرح سے پیش کیا ہے وہ نہ صرف اردو مثنوی بلکہ پوری اردو شاعری کیلئے بالکل ایک نئی چیز تھی۔اس لئے فوراً ہی ترقی پسند شاعروں کا دور آ جاتا ہے۔(۱) حقیقت پسندی، عوامی دردمندی، انقلاب واحتجاج کا ایک نیا دور، جہاں غلامی سر پر ہے، آزادی دو قدم پر ہے، زندگی چوراہے پر آ کھڑی ہے۔موضوعات کی بھیڑ ہے تو شاعروں کی بھی بھیڑ ہے سنجیدگی ہے، تو نعرہ بازی بھی ہے، بے لگامی ہے تو نظریاتی وابستگی بھی ہے، چنانچہ اسی دور سے ملحق اردو کی پہلی سیاسی مثنوی ''خانہ جنگی'' لکھی گئی۔(۲)

اردو شاعری کے دوسرے اصناف غزل قصیدہ، مرثیہ، رباعی وغیرہ کی طرح مثنوی بھی فارسی کی دین ہے اپنے موضوعات اور دیگر فنی خصوصیات کو لے کر یہ ایوان اردو شاعری میں داخل ہوئی اس کے ابتدائی نقوش دکنی ادب میں نظر آتے ہیں۔اکثر دکنی، سلاطین بھی شاعر گزرے ہیں اور شعر وادب کے وہ مربی بھی رہے ہیں، جنہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کے ساتھ انہوں نے چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی کہی ہیں۔ان مثنویوں کے بیشتر موضوعات حسن وعشق ہی ہیں، جزوی طور پر ان میں ہندوستان کا جغرافیائی اور ثقافتی ذکر بھی شامل ہیں۔جو اردو زبان وادب کے ارتقاء کے ساتھ اس دور کے شعر وادب میں فطری طور رچ گیا ہے اس ثقافتی تہذیبی ماحول کے نمونے بابا فرید گنج شکر کی مثنویوں سے لیکر قطب مشتری پھول بن اور کدم راؤ پدم راؤ میں بھی موجود ہیں۔حاتم اور آبرو کے بعد شمالی ہند میں میر اور سودا نے اچھی مثنویاں تخلیق کی ہیں اور اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔سودا کی مثنویاں ان کی قادرالکلامی کی دلیل ہیں، جبکہ میر کی مثنویاں عشق وحسن کی گھاتوں کے ساتھ ساتھ عصر آگہی اور زمانہ شناسی کا بھی ثبوت فراہم کرتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل فراموش ہے کہ میر، سودا، مصحفی اور شیر علی افسوس جیسے ماہران فن اور اساتذۂ سخن کی کاوشوں کے باوجود یہ صنف سخن فکر وفن کی بلندیوں کو نہ چھو سکی اردو مثنوی کا اصل فروغ اور باضابطہ شہرت ومقبولیت میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور اس کے بعد دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم حاصل ہو سکی میر حسن کی سحر البیان میں زبان زبیان کی چاشنی، محاورے اور

---

(۱) اردو کی پہلی سیاسی مثنوی خانہ جنگی: علی احمد فاطمی کیفی اعظمی فن اور شخصیت—شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴ء ص ۲۸۲۔

(۲) علی احمد فاطمی کیفی اعظمی فن اور شخصیت—شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز ۲۰۰۴ء ص ۲۸۲۔

اصطلاحیں سب ہی لاجواب ہیں۔ کم وبیش یہی صورت گلزار نسیم کی بھی ہے اس میں لکھنوی زبان اور صنعت گری کی خصوصیات غزل کی طرح ہیں، جو دلکش بھی ہیں اور جاذب نظر بھی۔ میر حسن یا نسیم نے جو موضوعات منتخب کئے، وہ خیالی اور تفریحی ہیں اور حقائق روزگار سے بیزاری اور فرار کی راہ ہموار کرتے ہیں یہ انداز اس دور کے عمومی اثرات کا نتیجہ ہے۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں مرزا شوق لکھنوی نے ''زہر عشق'' لکھ کر اردو مثنوی کو پرستان کی خیالی دنیا سے نکال کر انسانوں کے بیچ میں لاکر کھڑا کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب زندگی اور ادب کے حالات بدلے تو اس کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی شعور میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ چنانچہ دور جدید کے اہم شاعروں نے غزلوں اور نظموں کے ساتھ مثنویاں بھی لکھیں اس طرح ایک اندازہ اور رواج کے ساتھ اردو مثنوی میں مناظر فطرت، حب الوطنی اور خواب امن (آزاد) 'برکھارت' 'نشاط امید' اور 'حب وطن' (حالی) اور شبلی کی صبح امید وغیرہ اس عہد کی نمائندگی کرتی ہیں۔ آزاد، حالی اور شبلی کے بعد نظم طباطبائی، شوق قدوائی، درگا سہائے سرور، برج نرائن چکبست، اسماعیل میرٹھی اور اقبال نے اسے اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اقبال نے اپنی مثنوی 'ساقی نامہ'' میں حیات وکائنات کے فلسفے کو ایک نئی فکری جہت اور جدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی دور میں حفیظ جالندھری کو مثنوی شاہنامہ اسلام کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

اسی دور سے ملحق ترقی پسند شاعری کا زمانہ حقیقت پسند، عوامی دردمندی اور انقلاب اور احتجاج کا ایک نیا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس دور میں سردار جعفری نے جمہور اور کیفی اعظمی نے مثنوی ''خانہ جنگی'' لکھی، ان دونوں ترقی پسند شاعروں نے پہلی بار عصری سیاست کے رنگ میں اردو مثنوی کو رنگ کر پیش کیا۔ جزوی طور پر سماجی اور سیاسی اثرات بھی مثنویوں میں شامل ہوتے رہے۔ میر کی مثنویاں اس کی واضح مثال ہیں، حالی کے یہاں بھی اس کی گونج واضح ہے۔ شاد عظیم آبادی کی ''مادر ہند'' اور اقبال کی مثنویوں میں بھی سیاسی رنگ ورجحانات کا پرتو جھلکتا ہے۔ لیکن کیفی اعظمی پہلے شاعر ہیں، جنھوں

نے با قاعدہ سیاسی اور سماجی حالات اور فرقہ وارانہ فسادات کو واقعاتی اور تصوراتی رنگ دیکر اپنی مثنوی ''خانہ جنگی'' لکھی۔ اس مثنوی کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''اس سلسلے کی سب سے کامیاب مثنوی خانہ جنگی ہے، جو حالی کے'' شکوہ ہند'' کے جواب میں لکھی گئی ہے، اور فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔''(۱) جس کے جواب میں گیان چند لکھتے ہیں:

''شکوہ ہند اور مثنوی خانہ جنگی میں دور تک کوئی تعلق نہیں شکوہ ہند ملی نظم ہے خانہ جنگی ہندو مسلم اتحاد کی نقیب اور بدیسی حکومت کے خلاف احتجاج کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس نظم کو مناسبت ہے تو حالی کی مثنوی حب وطن سے''(۲)

پروفیسر گیان چند کی تحریر کے مطابق یہ مثنوی کامیاب نہیں ہے اس میں زبان و بیان الفاظ کا استعمال اور قافیہ پیائی تاریخی شواہد تلمیحات سبھی کو وہ ناقص خیال کرتے ہیں اور اس ضمن میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''۱۹۴۶ء کے سیاسی پس منظر کو اس نظم میں بڑی حقیقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، لیکن آخری حصے میں اپنے عقیدے کے جبر کے تحت جو سرمایہ دار اور زمیندار کو ہڑکایا ہے اس سے اس نظم کی وحدت تاثر مجروح ہوئی ہے۔''(۳)

لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی اس مثنوی کو اپنی نوعیت کی منفرد مثنوی ٹھہراتے ہیں:

''ان کی (کیفی اعظمی) طویل سیاسی مثنوی خانہ جنگی اردو کے شعری ادب میں اپنی نوعیت کی منفرد تخلیق ہے۔''(۴)

شافع قدوائی کا خیال ہے کہ کیفی کے یہاں حالی شبلی اور اقبال کے بلیغ شعری اظہار کے نمونے بالکل نئے تناظر میں پیش ہوئے ہیں اور کیفی کو پرانے فن پاروں سے خاص مناسبت ہے۔ وہ اس مثنوی خانہ جنگی کے

---

(۱) اردو میں ترقی پسند ادب خلیل الرحمٰن اعظمی ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۱۹۹۶ء۔

(۲-۳) خانہ جنگی ایک سیاسی مثنوی گیان چند جین فکر و فن اور شخصیت کیفی اعظمی اطہر نبی ص ۲۸ سہارا انڈیا پریوار ۱۹۹۴ء۔

(۴) کتاب نما دہلی ۱۹۹۵ ص ۴۳۔

متعلق اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

''ان کی سیاسی مثنوی جو بعض ناقدین کے نزدیک اولین مثنوی ہے، حالی کے شکوہ ہند کے طرز پر لکھی گئی ہے، یہاں محض جامد اور بے جان تقلید نہیں ہے بلکہ ایک نئی تخلیقی فضا کا احساس ہوتا ہے گو کہ شاعر کا سیاسی و سماجی شعور حالی سے مختلف اور آگے کی چیز ہے۔''(۱)

شافع قدوائی کی اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خلیل الرحمٰن اعظمی کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں او راس کی توسیع کرتے ہیں۔ مثنوی خانہ جنگی کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''سیاسی افکار و خیالات سے لبریز کیفی اعظمی کی یہ مثنوی ایک کامیاب تجربہ ہے او راردو مثنوی کا ایک خوبصورت توسیعی وارتقائی قدم ہے، جسے جتنا بھی سراہا جائے کم ہے.........سیاسی مناظر کو ابھارنا اور اسے اپنے عہد کا منظر نامہ بنا دینا بہر حال ایک مشکل کام تھا، جسے کیفی اعظمی نے پوری صداقت اور صلاحیت کے ساتھ پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے دو باتوں کی واقفیت بے حد ضروری ہے ایک تو صنف کی کلاسیکیت پر گرفت اس کی گرامر اور ہیئت پر گہری نظر دوسرے موضوع کے ساتھ وابستگی اور انصاف۔ کیفی اعظمی دونوں سطح پر کامیاب ہوئے ہیں۔''(۲)

مثنوی خانہ جنگی کیفی کے دوسرے مجموعہ کلام آخر شب میں شامل ہے۔ یہ مثنوی ستمبر ۱۹۴۶ء میں مکمل ہوئی اس مثنوی میں ۲۱۵ اشعار ہیں لیکن دو اشعار کی تین مرتبہ تکرار ہونے کی وجہ سے ۲۱۱ اشعار رہ گئے ہیں۔ یہ مثنوی موضوع کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم ہوسکتی ہے پہلا حصہ ۱۳۸ اشعار کا ہے اور دوسرا حصہ صرف ۷۷ اشعار کا،، جس کا عنوان عوام ہے خانہ جنگی کا پہلا بڑا جزو انگریزوں کے خلاف ہے، جبکہ دوسرا جزو سرمایہ داروں اور کار خانہ داروں کے خلاف ہے۔ یہ مثنوی اس زمانے میں لکھی گئی جب ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کا اعلان ہو چکا

---

(۱) ماہنامہ ایوان اردو دہلی اکتوبر ۱۹۹۸ ص ۱۷۔

(۲) اردو کی پہلی سیاسی مثنوی خانہ جنگی علی احمد فاطمی۔ کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی ص ۲۹۷۔

تھا۔ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی ایسے وقت میں کیفی کے ایسے حساس اورغیر جانب دار شاعر کے پاس نا امیدی کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا اسی لئے اس کا آغاز کیفی نے غالب کے اس مایوسیوں سے لبریز شعر سے کیا تھا:

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

کیفی اعظمی ملک کی اس بدحالی اور فسادات کا ذمہ دا رانگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو (Divide and Rule) کی پالیسی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں:

جب سے آ کر گئے ہیں اہل مشن
زندگی کا بگڑ گیا ہے چلن
بھائی بھائی کا خوں بہاتا ہے
ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

فسادات کے زمانے میں ایک شخص دوسرے شخص کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا ہے بازار سب بند ہیں محلوں، گلی کوچوں میں سناٹا اور سنسان ماحول ہے گلی گلی میں صرف پولیس کا راج ہے اور فوج گشت کرتی ہوئی پھرتی ہے اس صورت حال کی نہایت سچی اور دلکش تصویر ان اشعار میں کی گئی ہے:

سوکھتی ہے پڑوسیوں سے جان
دوستوں پر ہے قاتلوں کا گماں
لوگ گھر سے نکلتے ڈرتے ہیں
راستے سائیں سائیں کرتے ہیں
شہر ویراں ہیں بند ہیں بازار
اینڈتا ہے فضا میں گرم غبار

ناکے ناکے پہ ہے پولیس کا راج
ہوچکی ہے گلی گلی تاراج
جیپ ہر موڑ سے گزرتی ہے
ہر طرف فوج گشت کرتی ہے

اس کے بعد کلکتہ کی زمین کو خطاب کرتے ہوئے وہاں کی پھیلی ہوئی بدحالی کا ذکر کرتے ہیں اور پھر فسادات کے نتائج اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہوگئے بند کتنے کاروبار
کتنے مزدور بیٹھے ہیں بیکار
مٹ گئی آس بدنصیبوں کی
روٹیاں چھن گئیں غریبوں کی

مندرجہ بالا صرف دو اشعار میں کیفی نے کلکتہ اور وہاں پھیلی ہوئی بدامنی بگڑی ہوئی صورت حال کا مکمل نقشہ پیش کردیا ہے اسی طرح بہار اور نوا کھالی کی زبوں حالی اور بدترین حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے فسادات، قتل وغارت گری، تباہی وبربادی، عورتوں کی بے حرمتی اور آبروریزی کا ذکر کرتے ہیں۔ طرفہ تماشہ یہ کہ ان سارے معاملات میں انگریزوں کے ساتھ ان کے حاشیہ برداروں کا بھی تمام فسادات اور بدامنیوں میں برابر شریک کار ہونے کا پول کھولتے ہوئے ان پر بھرپور طنز بھی کرتے ہیں۔

فطرت شرع میں فساد نہیں
رہزنی داخل جہاد نہیں
کہہ کے تکبیر باندھ کر نیت
ماؤں بہنوں کی لوٹ لی عزت

راست اقدام خوں میں ڈوب گیا

آج اسلام خوں میں ڈوب گیا

بنگال نواکھالی بہار وغیرہ کے فسادات کا ذکر کرنے کے بعد وہ دہلی اور ممبئی کا بھی قصہ درد سناتے ہیں، جہاں چاروں طرف خون ہی خون اور لاشوں کے ڈھیر نظر آتے ہیں، جن میں کیفی کی فکر کے مطابق قرآن وید ترنگا اور اہنسا سب ہی ڈوب جاتے ہیں۔

چار سو خون چار سو لاشیں

کو بہ کو خون رو برو لاشیں

یہ سارے مناظر دکھا کر کیفی ان فتنہ پرور لیڈروں کو آواز دیتے ہیں کہ آؤ اپنے کرتوت کا کرشمہ یہ لاشیں شمار کرو اس موقع پر ان کا حب الوطنی اور اخوت باہمی کا جذبہ کافی پرجوش انداز اختیار کر جاتا ہے۔ ان کے مطابق یہ لاشیں ہندو یا مسلمان کی نہیں ہیں بلکہ اکھنڈ بھارت کی ارتھیاں ہیں مثنوی کے اس حصے میں ایک نئی جان ایک نیا جذبہ ہندوستان کی مختلف سماجی، سیاسی، قومی اور مذہبی تنظیموں اور اداروں سے تعلق رکھنے والے فتنہ پرور اور فتنہ جو قسم کے عناصر کو خطاب کرتے ہوئے اپنے بھرپور طنز سے حدف ملامت بناتے ہیں لیکن لہجہ کی سبک روی بات ناگوار نہیں بننے دیتی:

لو یہ ہے شیخ و برہمن کی لاش

نسل کی قوم کی وطن کی لاش

لاش علم و ادب کی حکمت کی

لاش کلچر کی آدمیت کی

لاش سوراج کی خلافت کی

لاش ہر جہد ہر بغاوت کی

لاش ہے یہ علاحدیت کی

لاش ہے یہ اکھنڈ بھارت کی

اور اس سارے کشت و خون سفا کی و بربریت اور قصابی کے روح رواں انگریز، جنہوں نے اپنی حد درجہ جعل سازیوں سے کام لیتے ہوئے یہاں کی آپسی محبتوں کے دامن کو لڑاؤ اور حکومت کرو(Divide and Rule) کے نظریہ کے تحت ہندوستان کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور آخر کار انہوں نے ملک کی صورت حال اس درجہ بگاڑ کر رکھ دی۔ مختصر لفظوں میں یہ سارا قصہ درد ملاحظہ کیجئے:

زیست کا بند بند کھول دیا
پھوٹ کا زہر خوں میں گھول دیا

انگریزوں کی زہرناکیوں کے ذکر کے بعد کیفی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان کی عظمت ماضی کی یاد تازہ کراتے ہیں یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سب ہی بلا تفریق رنگ و نسل متحد ہو کر ملک کی آزادی کے لئے اپنی اپنی جانیں نچھاور کئے ہوئے تھے۔ مثنوی کے اس طویل حصے میں جوش وولولے دلوں میں بھرنے کے ساتھ عہد ماضی کے ہندو مسلم اتفاق و اتحاد کو نہایت معنی خیز اشاروں اور کنایوں اور نہایت پر اثر انداز میں پیش کرتے ہیں:

قابل دید تھا جہاد کا جوش
ہندو مسلم رواں تھے دوش بدوش
ایک ساتھ اٹھ رہے تھے سب کے قدم
ایک ساتھ اڑ رہے تھے سب پرچم
ایک ہی جست ایک ہی رفتار
ایک ہی نعرہ ایک ہی للکار
ایک ہی سعی ایک ہی حاصل
ایک ہی مقصد ایک ہی منزل

ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہوئے کیفی بنگال کے ایک مسلمان کا واقعہ بیان کرتے ہیں، جس نے کئی شہید کی قبر کی مٹی لیکر ہندو مسلم اتحاد کی دعا کی تھی:

ارض بنگال یاد تو ہوگا

تجھ کو منظر وہ ایک مرقد تھا

جمع ہندو بھی تھے مسلماں بھی

دھرم بھی سرخ رو تھا قرآں کا

لے کے مٹھی میں قبر کی مٹی

ایک مسلمان نے دعا کی تھی

نقش رنگِ جہاد میں بھردے

ہندو مسلم کو متحد کردے

لیکن افسوس کہ یہ سب بیکار ہی ثابت ہوا اور انگریزوں کی تمام تر چالیں کامیاب ہوگئیں کیفی یہ کہتے ہوئے کف افسوس ملتے ہیں:

شاد طبع ملول ہو نہ سکی

وہ دعا بھی قبول ہو نہ سکی

کیفی نے اپنے نقطہ نظر کے مطابق ممبئی کے ملاحوں کی بغاوت اور گودی مزدوروں کی ہڑتال کا ذکر بھی کیا ہے:

یاد آتا ہے آج رہ رہ کر

ساحل ممبئی تیرا منظر

وہ جیالے وہ دل چلے ملاح

وہ بہادر وہ من چلے ملاح

جن کو تڑپا رہی تھی محکومی

خون کھولا رہی تھی محکومی

ظلم انسان کس قدر سہتے
کب تک آخر غریب چپ رہتے
زندگی کو جلال آ ہی گیا
سرد خوں میں اُبال آ ہی گیا

ہندوستانیوں کی آزادی کی جدوجہد میں مسلح کوششوں کو ناکام کرنے کے لئے ایک بڑی حد تک انگریزوں نے عیسائی تبلیغی مشنریوں سے کام لیا۔ اس طرح معاشرے کی اصلاح اور سماج سیوا کے نام پر بھی انگریزوں نے مقبولیت حاصل کی اور اس کے بدلے میں ہندوستانیوں نے اہل مشن کو کامیاب کرکے ان سے نفاق اور خانہ جنگی کا تحفہ لے لیا:

مائل لطف تھے جو اہل مشن
عاجزانہ بڑھا دیے دامن
ہو کے مسرور دے کے دل سے دعا
خانہ جنگی کا لے لیا تحفہ

ان ہی اشعار پر مثنوی کا پہلا حصہ ختم ہوتا ہے۔ مثنوی کا دوسرا حصہ جو ۷۷ اشعار پر مشتمل ہے عوام کے عنوان سے کیفی نے شروع کیا ہے یہ حصہ سرمایہ داراں اور کارخانہ داروں کے خلاف ہے کیفی عوام کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ سماج میں خانہ جنگی کے زہر گھل جانے کے بعد چنداں غمگین ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ یہ تو زرداروں اور حکمرانوں کا آخری داؤ ہے۔ لیکن وہ مطمئن کرتے ہیں کہ مزدور، کسان، بوڑھے، جوان سب بیدار ہونے لگے ہیں کسانوں کی بیداری سے زمیندار طبقہ ہراساں وترساں ہے اب وہ دور آ گیا ہے کہ جو جس قدر محنت کرے گا اسی قدر اسے اس کا پھل بھی ملے گا۔ کسان دن رات کھیتوں میں خون و پسینہ ایک کرکے محنت کرتے اور فصل اگاتے ہیں اب فصل پر انہیں کا حق ہوگا اور وہ دن دور نہیں جب انہیں کسی کے سامنے گڑگڑانے یا ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ رہ جائے گی پیغام رجائیت سے بھرپور یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

اے وطن اس قدر راداس نہ ہو

اس قدر غرق رنج ویاس نہ ہو

خانہ جنگی ہے آخری حربہ

زرپرستوں کا حکمرانوں کا

قلب جمہور ہوچکا بیدار

عزم مزدور ہوچکا بیدار

لی کسانوں نے تن کے انگڑائی

نوجوانوں نے کی صف آرائی

خانہ جنگی کے اس اندھیرے میں

جل رہی ہیں ہزار قندیلیں

مزدور طبقہ کی بیداری سے کارخانوں پر ہڑتالیں ہورہی ہیں جلوس نکالے جا رہے ہیں، جنہیں دیکھ کر کارخانوں کے مالک خوفزدہ ہیں۔

کارخانوں سے آرہے ہیں جلوس

منتشر صف جمارہے ہیں جلوس

اب یہ حوصلہ ان میں پیدا ہورہا ہے کہ ہم سب ایک بار متحد ہوکر پھوٹ اور نفاق کا قلع قمع کردیں گے، جس کی وجہ سے سفاکی درندگی قتل وغارت گری سب نیست ونابود ہوجائے گی:

پھوٹ کی آگ ہم بجھادیں گے

قتل وغارت گری مٹادیں گے

اور پھر سرمایہ داری کا دور تمام ہوجائے گا اور مفلسی، ناداری، بھوک مری سب مٹ جائیں گے سماج کے چہرے سے لعنت کا داغ دھل جائے گا اب وہ دن دور نہیں جبکہ:

ختم ہوتا ہے دور خوں خواری

ٹلتی ہے لعنت زمینداری

مثنوی کے آخر میں کیفی انقلاب کا مژدہ سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ انقلاب کو اب کوئی طاقت روک نہ پائے گی کیونکہ:

اب یہ طوفان بڑھتا جائے گا

اب یہ سیلاب چڑھتا جائے گا

اس مثنوی میں کیفی نے مختلف جگہوں کے واقعات اور سانحات مختصراً اشارتی طور پر نظم کئے ہیں اور ان کا حل پیش کرتے ہوئے عوام کو یقین دلایا ہے کہ وہ مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔کلید کامرانی صرف یہ ہے کہ ہم متحد ہو کر اپنے مسائل حل کرنے کی فکر کریں۔اس میں نادانی اور عقل مندی، بزدلی اور بہادری کے مابین تاریخی اور تلمیحی اشاروں کے ذریعے خط امتیاز کھینچ کر اپنے موضوع کا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی رقم طراز ہیں:

''ایک طرح سے یہ مثنوی ماضی بعید، ماضی قریب کے اشارں سے لبریز اپنے عہد کا مکمل رزم نامہ بن کر سامنے آتی ہے یہ سچ ہے کہ اس نظم میں کیفی اعظمی کہیں کہیں کچھ زیادہ ہی آدرش وادی اور کمیونسٹ پارٹی کے آرگن بنتے نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی عام انسانوں کے تئیں ان کا خلوص اور ملک اور سماج کیلئے ان کا بے لوث پیار بہتے ہوئے انسانی خون پر ان کا درد ان کی اس مثنوی میں پورے طور پر رچ بس گیا ہے۔''(۱)

اس گفتگو کے باوجود وہ اس مثنوی کو گرانقدر مثنوی تسلیم کرتے ہیں حالانکہ اس نظم خانہ جنگی سے کچھ دن پہلے علی سردار جعفری نے جمہور نام کی مثنوی تحریر کی تھی، جو ایک سیاسی مثنوی ہے لیکن کیفی اعظمی کا استدلال ہے کہ:

''پہلے خانہ جنگی تخلیق ہوئی اس کے بعد جمہور اشاعت میں پہلے استدلال جمہور منظر پر آئی صرف چند ماہ قبل۔اردو میں پہلی بار سیاسی مثنوی میں نے کہی۔''(۲)

(۱) اردو کی پہلی سیاسی مثنوی خانہ جنگی علی احمد فاطمی، کیفی اعظمی اور جہتیں شاہد ماہلی ص ۴۹۸-۴۹۷۔

(۲) خانہ جنگی ایک سیاسی مثنوی گیان چند جین فکر و فن اور شخصیت کیفی اعظمی، ص ۲۵۔

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اپنی کتاب اردو مثنوی کا ارتقاء میں خانہ جنگی کو ہی اردو
کی پہلی سیاسی مثنوی کی حیثیت دیتے ہیں۔"(۱)

کیفی کی مثنوی خانہ جنگی، سحرالبیان اور گلزار نسیم کی طرح طویل مثنوی نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر سماجی سیاسی کشمکش اور شکست وریخت کی مکمل داستان رکھتی ہے کیفی کا چونکہ یہ پہلا تجربہ تھا اس لئے اس میں خامیاں ہونے کے باوجود اسے کامیاب سیاسی مثنوی کا تجربہ کہا جاسکتا ہے، جس میں کیفی نے نئی شراب پرانی بوتل میں بھر کر پیش کی ہے۔ راج بہادر گوڑ اس مثنوی پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"کیفی نے خانہ جنگی میں عصری قومی حقیقتوں کو روایتی لباس پہنایا ہے، میر حسن اور دیا شنکر نسیم بھی آج ہوتے تو اس لمحے یہی کچھ کرتے۔"(۲)

خانہ جنگی میں زبان عام فہم اور سادہ ہے سید محمد عقیل رضوی لکھتے ہیں:

"کیفی نے خانہ جنگی میں زبان بڑی سادہ مگر فنکارانہ طور سے استعمال کی ہے............ان سے محاورات عروض وقوافی کی غلطیاں نہیں ہو پاتیں............مگر مثنوی کی بحر نے ان کے اشعار میں وہ برق رفتاری اور ہمہمہ نہیں پیدا کیا، جو جعفری کی مثنوی جمہور میں موجود ہے۔"(۳)

اردو شاعری کے عصری تناظر میں مثنوی خانہ جنگی کی قدر ومنزلت سے انکار نہیں کیا جاسکتا مختلف نقادان فن نے اس کے گرانقدر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

کیفی اعظمی کی فلمی شاعری

فلمی دنیا کی چمک دمک دیکھ کر بہت سے شاعر اور ادیب ممبئی کی طرف کھنچتے چلے گئے تھے لیکن پریم چند اور

---

(۱) اردو مثنوی کا ارتقاء سید محمد عقیل اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۱ء۔
(۲) کیفی اعظمی راج بہادر گوڑ کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی ص ۲۹۳۔
(۳) اردو مثنوی کا ارتقا سید محمد عقیل اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۱ ص ۲۹۷۔

جوش جیسے عظیم ادیب وشاعر یہاں بھی کامیاب نہ ہو سکے اس لئے کہ فلمی دنیا کا مطمح نظر ادب پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اولین مقصد تجارتی ذہنیت ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر شعراء فلمی شاعری کو وسیلۂ معاش ٹھہراتے رہے۔ابتدائی دور میں صرف آرزو لکھنوی ایسے شاعر گزرے ہیں، جنھوں نے فلمی شاعروں میں ادبی معیار کو بھی مدنظر رکھا یہاں کے ماحول میں آرزو کے علاوہ آغا حشر کاشمیری یقیناً کامیاب رہے۔۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کے پندرہ سال کے عرصے میں اردو کے کئی ترقی پسند ادیب وشاعر ممبئی جا کر بس گئے۔ یہاں فلم جیسے نشرواشاعت کے وسیلے ان کی اس طرف کشش کا باعث بنے تھے چنانچہ جن ترقی پسندوں نے اس خیال سے ادھر توجہ کی وہ آگے چل کر شاعروں ادیبوں اور فنکاروں کی روزی روٹی کا وسیلہ بھی بن گیا۔گیت کار کی حیثیت سے فلم سے وابستہ شاعروں میں مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں ان کی ادبی شناخت بھی مسلم ہے۔

فلمی گیتوں میں ادبی معیار کی کمی سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن ترقی پسندوں کے فلمی دنیا میں آجانے سے ایک نئے دور کا آغاز ضرور ہوا، اور فلمی شاعری میں بھی شعریت اور ادبی نکھار اور حسن پیدا ہونا شروع ہوا اس ضمن میں ڈاکٹر محمد ذاکر لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسندوں نے فلمی گیتوں میں بھی شعریت اور ادبی نکھار کا خیال رکھا ہے ان ہی کی تخلیقات کے پیش نظر اب فلمی گیت کو محض ریکیک تک بندی کا نام نہیں دیا جاسکتا انہوں نے فلمی گیت کو حسن بیان بھی بخشا ہے اور تخئیل کی لطافت اور جذبات کی پاکیزگی بھی۔ان کے اکثر گیت اس دور کی اردو شاعری میں ایک نمایاں اضافہ ہیں۔ان میں سے کچھ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر ذاکر صاحب کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں نے اپنے فلمی گیتوں، فلمی شاعری کے ادنیٰ معیار اور پست ہو چکے درجات کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی ایک فلمی شاعر اکثر اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ کہانی کے موقع ومحل فلم سازوں اور میوزک کے ڈائریکٹروں کی ہدایت کے مطابق گیت نظم کرے۔ شاعر

(۱) آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب ڈاکٹر محمد ذاکر ستمبر ۱۹۸۱ء مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر دہلی ص ۲۲۸۔

فطرتاً خوددار اور حساس ہوتا ہے۔ وہ شاعری پر پابندیوں اور حد بندیوں کو برداشت نہیں کرتا۔ لیکن فلمی دنیا میں داخل ہوکر تخلیق کے معیار کا احترام ولحاظ اور معاش کی کشمکش میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر ترقی پسندوں نے ان تمام حد بندیوں کے باوجود ادبی معیار باقی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ان فنکاروں کی اجتہادی کوششوں سے فلم سازوں اور فلم بینوں کے مذاق میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ تخئیل کی لطافت بیان کی خوبی جذبات کی پاکیزگی کا اظہار ان فلمی گیتوں میں عام طور پر کیا جانے لگا پھر ہیئت اور ساخت اور موضوع میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی ہجر کی شکایت اور غمگینی، وصل کی شادکامی اور لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ حب وطن سماجی سیاسی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی بھی فلمی گیتوں کا موضوع بنے ترقی پسندوں کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنے لکھے ہوئے فلمی گیتوں میں نہایت فنکارانہ ہنرمندی سے زندگی اور زندگی کے تقاضوں کی ترجمانی کی ہے بقول ڈاکٹر اجمل اجملی:

> ''فلمی گیتوں نے ترقی پسند خیالات کو عام کرنے اور محنت کش عوام کو جدوجہد پر ابھارنے کے سلسلے میں زبردست رول ادا کیا ہے۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ترقی پسند شاعروں نے اپنے مقاصد کی تبلیغ کیلئے فلم کے امکانات سے پوری طرح استفادہ کیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اہم ترقی پسند شعراء نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی اس طرف توجہ دی، پاکستان میں حمایت علی شاعر حبیب جالب اور خود فیض احمد فیض نے ایسے گیت لکھے ہیں، جن میں ترقی پسند گیتوں کی ساری روایات موجود ہیں۔''(۱)

لگ بھگ ۱۹۴۸ء میں کیفی اعظمی نے فلمی دنیا میں قدم رکھا اور کچھ ہی برسوں میں انہوں نے یہاں اپنی شناخت قائم کرلی۔ وہ ایک نمائندہ ترقی پسند شاعر ہیں۔ انہوں نے فلمی شاعری کو نہ صرف وسیلہ معاش ٹھہرایا بلکہ شعوری طور پر اسے زیادہ دلکش اور سماجی نقطہ نظر سے مفید اور بامقصد بنانے کی طرف توجہ کی۔ کیفی اعظمی نے فلموں کے لئے جو گیت لکھے ان میں سے اکثر فلمی شاعری کی عام روش سے الگ تھلگ ہیں۔ جنہیں پڑھ کر یہ

(۱) ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی ص ۱۱۴ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۴ء۔

محسوس نہیں ہوتا کہ یہ فرمائشی گیت ہیں اور بغیر کسی تحریک کے دی ہوئی یا بتائی ہوئی دھنوں اور مقررہ منظر ناموں پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں شعریت بھی ہے اور جذبہ و احساس کی شدت بھی، بعض گیت اسلوب اور ساخت کے اعتبار سے ہندی روایتی گیتوں سے قریب تر ہیں، جبکہ انہوں نے زیادہ تر گیتوں میں اردو زبان اور اردو بحروں کا استعمال کیا ہے۔ دھنوں کی پابندی کی وجہ سے ان کے اوزان میں تبدیلی ضرور کر دی گئی ہے۔ کیفی اعظمی کے فلمی گیتوں میں گیت، غزل اور نظمیں وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔ تمام غزلیں مسلسل ہیں، جو گیت کا مزاج اور آہنگ رکھتی ہیں۔ بعض نظمیہ انداز میں لکھے گئے گیت ایسے ہیں، جن پر عنوان لگا دیا جائے تو نظم کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں رہ جاتا۔ ان کی کئی نظمیں بھی فلموں میں استعمال ہوئی ہیں، جیسے پشیمانی اور عورت وغیرہ۔ بعض نظموں کو تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد فلم میں پیش کیا گیا ہے جیسے اندیشے وغیرہ۔

کیفی نے فلموں کیلئے سیکڑوں کی تعداد میں گیت لکھے ہیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عشق و محبت کے موضوعات کے علاوہ جن موضوعات پر کیفی سے گیت لکھوائے گئے ان میں سب سے اہم حب وطن ہے، بقول سبودھ لال:

> ''کیفی کو اکثر ایسی فلموں کے گیت لکھنے کو کہا گیا، جہاں دیش بھگتی کا جذبہ کہانی کا اہم حصہ ہو، مثلاً حقیقت، ہندوستان کی قسم، نونہال ان اور دیگر فلموں میں کیفی نے جو دیش بھگتی کے گیت لکھے ہیں، وہ کل شاعری میں اس قسم کے بہترین گیتوں میں شامل ہیں۔'' (۱)

مثلاً حقیقت فلم کا گیت:

''کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو''

میں وطن سے محبت کی سرشاری احساس کی شدت بیان کی تازگی و سادگی سبھی عناصر سے مزین ہے، جو اس کی کامیابی اور مقبولیت کا زندہ اور جیتا جاگتا ثبوت ہے:

---

(۱) کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی کیفی کی فلمی شاعری سبودھ لال ص ۵۰۴۔

کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو
زندہ رہنے کے موسم بہت ہیں مگر
جان دینے کی رت روز آتی نہیں
حسن اور عشق دونوں کو رسوا کرے
وہ جوانی جو خوں میں نہاتی نہیں
آج دھرتی بنی ہے دلہن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو
کھینچ دو اپنے خوں سے زمیں پر لکیر
اس طرف آنے پائے نہ راون کوئی
توڑ دو ہاتھ اگر ہاتھ اٹھنے لگے
چھونے پائے نہ سیتا کا دامن کوئی
رام تم ہی تم ہی لکچھمن ساتھیو
اب تمہار ے حوالے وطن ساتھیو

اسی نظم میں آگے ان خطرات اور امکانات سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ حفاظت وطن کے سلسلے میں کن مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اس لئے عزم واستقلال سے کمر بستہ ہو کر اپنی تمام تر خامیوں کا تدارک کرتے ہوئے وطن کی محافظت کرنا ہے۔

آندھی آئے کہ طوفاں کوئی غم نہیں
ہے یہی آخری امتحاں ساتھیو
اک طرف موت ہے اک طرف زندگی
بیچ سے لے چلو کارواں ساتھیو

پھوٹ کا دشمنی کا اندھیرا بھی ہے

ہر قدم پر غریبی کا ڈیرا بھی ہے

صرف راتیں ہماری نہیں ہیں سیاہ

دھندلا دھندلا سا اپنا سویرا بھی ہے

جیسے شعلہ بھڑکتا ہے بھڑکو کبھی

ہوتا جاتا ہے گہرا دھواں ساتھیو

حب الوطنی کا یہ جذبہ ان کے کئی اور گیتوں میں بھی ایسی ہی لازوال چھاپ چھوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیفی پنڈت نہرو سے خاص لگاؤ اور عقیدت رکھتے تھے۔ دوسرے کئی ترقی پسند شاعروں کی طرح کیفی بھی ان کی وفات پر اپنا نذرانہ عقیت پیش کر چکے تھے۔ اسی قسم کے جذبات کو جب انہیں فلم نونہال میں نمایاں کرنے کا موقع ہاتھ آیا تو ان کا قلم یوں جادو جگاتا ہوا نظر آتا ہے۔

میری آواز سنو پیار کا راز سنو

میری آواز سنو پیار کا راز سنو

میں نے اک پھول جو سینے پہ سجا رکھا تھا

اس کے پردے میں تمہیں دل سے لگا رکھا تھا

تھا جدا سب سے میرے عشق کا انداز سنو

میری آواز سنو پیار کا راز سنو

اسی طرح کی ایک اور مثال دیکھئے، جہاں کیفی عصر حاضر اور موجودہ روش زمانہ پر طنز کرتے ہیں، جن میں ان کی حقیقت پسندی کی جھلک نمایاں ہے، ملاحظہ کیجئے، کیا یہ آج ہمارا مذموم کردار نہیں ہے رہبران ملک وملت کی یہ روش ڈھکی چھپی ہے، جس پر قلم اس طرح اٹھایا گیا ہے:

ہاتھوں میں کچھ نوٹ لو پھر چاہے جتنے ووٹ لو

کھوٹے سے کھوٹا کام کرو باپو کو نیلام کرو

باپو باپو کرتے رہو زہر دلوں میں بھرتے رہو

پرانت پرانت کو تنگ کرے بھاشا سے بھاشا جنگ کرے

سب کو چاہئے اپنی زمیں ہندوستانی کوئی نہیں

وطن کی اس بدحالی سے کیفیؔ کو شکایت ہے کیونکہ ترقی ملک وقوم کی دشمن طاقتیں انتشار غریبی بھوک بیکاری وغیرہ بڑھتی ہی جاری ہیں اگر ان کا سد باب نہ کیا گیا اور ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ نہ پھینکا گیا تو ملک کی شکل بد سے بدتر حد تک بگڑ جائے گی۔ کیفیؔ نے اپنی شاعری میں جس طرح کے جذبات واحساسات نمایاں کئے ہیں حیات اور مسائل حیات کے بارے میں جو ان کا نقطہ نظر ہے وہی جذبہ ان کی فلمی شاعری میں بھی پوری طرح معطر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کیفیؔ مارکسی خیال کے حامی تھے، سماجی اور سیاسی مسائل کے بارے میں ان کا موقف بھی مارکسی نظریہ کی تائید کرتا ہے، کیفیؔ نے جہاں ہندوستان کی موجودہ صورت حال پر آوازہ کشی کی وہ طنز سے بھرپور ان کی تنقیدی روش ہے اسی طرح مستقبل کے ترقی یافتہ اور خوش حال ہندوستان کا خواب انہوں نے خود دیکھا بھی اور دکھایا بھی۔

ہم کو انساں میں ہے خدا کی تلاش

تم تجوری میں اس کو ڈھونڈتے ہو

یہ تمہارے گھڑی گھڑی سجدے

یہ تمہاری گھڑی گھڑی پوجا

ایک رشوت ہے بندگی کیا ہے

کون سوچے کہ زندگی کیا ہے

کیفیؔ صرف وطن پرست ہی نہیں بلکہ انسان اور انسانیت پسند بھی ہیں۔ ان کا پیغام محبت ہے جہاں تک

پہونچے اس لئے عالمی برادری اور بھائی چارگی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ساری دنیا کی مشکلوں اور پریشانیوں سے مغموم اورافسردہ خاطر ہیں، وطن کی الفت سماجی سیاسی اور عمرانی مسائل کے ساتھ ساتھ زندگی اور زندگی کے تقاضوں کو بھی انہوں نے اپنے فلمی گیتوں میں بھر دیا ہے:

دیکھی زمانے کی یاری

بچھڑے سبھی باری باری

اڑاڑ جا پیاسے بھونرے

رس نہ ملے گا خاروں میں

بیٹھ نہ ان گلزاروں میں

نادان تمنا رہتی ہے

امید کی کشتی کھیتی ہے

اک ہاتھ سے دیتی ہے دنیا

سو ہاتھوں سے لے لیتی ہے

یہ کھیل ہے کب سے جاری

بچھڑے سبھی باری باری

کیفی کے یہاں انسانی رشتوں کی کشمکش کا تذکرہ ایک خاص قسم کا کرب سوز اور تڑپ لئے ہوئے ہے بکھرے رشتوں ناطوں سے حساس اوران کا جراحت رسیدہ دل اکیلے پن کا احساس بھی ان میں قنوطیت نہیں پیدا کرتا ہے، برخلاف اس کے وہ زندگی اوراس کی قدروں سے امیدیں وابستہ رکھتے ہیں، اس کی یہ اچھی مثال دیکھئے:

وقت نے کیا کیا حسیں ستم

تم رہے نہ تم، ہم رہے نہ ہم

جائیں گے کہاں سوجھتا نہیں

چل پڑے مگر راستہ نہیں

کیا تلاش ہے کچھ پتہ نہیں

بُن رہے ہیں دل خواب دم بدم

فلم کی پابندیاں فلمی شاعر کی اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ کہانی اور فلم کے مناظر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی گیت لکھے اسی طرح ہر کردار کے حسین اور نازک ترین جذبات کی تصویر کشی کر کے شاعر اپنی صلاحیتوں سے کہانی میں جان ڈال دیتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ گیت دیکھئے:

ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں

ملو تو آنکھ چرائیں

ہمیں کا ہوگیا ہے

ہمیں کیا ہوگیا ہے

تم ہی سے دل کا راز بتائیں

تم ہی سے راز چھپائیں

ہمیں کیا ہوگیا ہے

ہمیں کیا ہوگیا ہے

دھیرے دھیرے مچل اے دل بیقرار کوئی آتا ہے

یوں تڑپ کے نہ تڑپا مجھے بار بار کوئی آتا ہے

روٹھ کر پہلے جی بھر ستاؤں گی میں

جب منائیں گے وہ مان جاؤں گی

دل پہ رہتا ہے ایسے میں کب اختیار کوئی آ تا ہے

دھیرے دھیرے تڑپ ....

مندرجہ بالا گیتوں میں نسوانی جذبات کی بھرپور اور خوبصورت ترجمانی کی گئی، اس وجہ سے یہ بے حد مقبول ہوئے اس طرح کیفی اعظمی کے دوسرے کئی اور گیت اور نغمے حساس طبع لوگوں کو متاثر کرتے ہیں، مثلاً:

یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں- میرے کام کی نہیں

صحرا میں آکے بھی مجھ کو نہ ملا

غم بھولانے کا کوئی بہانہ نہ ملا

کیا دیکھوں اسی سنسار کو

دل تڑپے جس میں پیار کو

اک جیتی بازی ہار کے

میں ڈھونڈوں بچھڑے یار کو

یہ دنیا میرے کام کی نہیں --میرے کام کی نہیں

(ہیر رانجھا)

ملے نہ پھول تو کانٹوں سے دوستی کرلی

اسی طرح سے بسر ہم نے زندگی کرلی

وہ جن کو پیار ہے چاندی سے عشق سونے سے

وہی کہیں گے کبھی ہم نے خودکشی کرلی

......☆☆☆......

دیکھی زمانے کی یاری بچھڑے سبھی باری باری!

کھالے کے ملیں اس دنیا سے، آنسو کے سوا کچھ پاس نہیں

یاں پھول ہی پھول تھے دامن میں، یاں کانٹوں کی بھی آس نہیں

مطلب کی دنیا ہے ساری، بچھڑے سبھی باری باری

وقت ہے مہرباں، آرزو ہے جواں

فکر کل کی کریں، اتنی فرصت کہاں

فلم ''کاغذ کے پھول''

تم اتنا جو مسکرا رہے ہو

کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو

آنکھوں میں نمی لبوں پہ ہنسی

کیا حال ہے کیا دکھا رہے ہو

ہندوستانی فلموں میں گیتوں کی شمولیت ضروری خیال کی جاتی ہے، اس لئے کہ شاعری اور گیت جذباتی اظہار کی ادائیگی و اداکاری میں معاون ہوتے ہیں:

آج سوچا تو آنسو بھر آئے

مدتیں ہوگئیں مسکرائے

ہر قدم پر ادھر مڑ کے دیکھا

ان کی محفل سے ہم اٹھ تو آئے

دل کی نازک رگیں ٹوٹتی ہیں

یا د اتنا بھی کوئی نہ آئے

کیفی کی فلمی شاعری کا خاص وصف یہ ہے کہ انہوں نے اس میں ادبیت اور ادبی معیار اور رکھ رکھاؤ کا خاص لحاظ قائم رکھا ہے، انہوں نے زبان و بیان اور اسلوب کی دکھتی رگ کو برقرار رکھتے ہوئے فلمی نغموں کے

تار و پود اور مواد کو سماجی اور معاشرتی نقطہ نظر کے تحت مفید اور کار آمد بنانے کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ تغزل میں غرقاب ان کا مخصوص رنگ فلمی مناظر کے مجموعی تاثر میں اضافہ کرتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

شکل پھرتی ہے نگاہوں میں وہی پیاری سی
میری نس نس میں مچلنے لگی چنگاری سی
چھوگئی جسم میرا کس کے دامن کی ہوا
کہیں وہ تو نہیں کہیں وہ تو نہیں
جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے

......☆☆☆......

اب نہ وہ پیار نہ اس پیار کی یادیں باقی
آگ یوں دل میں لگی، کچھ نہ رہا کچھ نہ بچا
جس کی تصویر نگاہوں میں لئے بیٹھی ہو
میں وہ دلدار نہیں اس کی ہوں خاموش ادا

......☆☆☆......

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو
مگر اس نے روکا نہ نہ اس نے منایا
نہ دامن ہی پکڑا نہ مجھکو بٹھایا
نہ آواز ہی دی نہ مجھ بلایا
میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا

......☆☆☆......

زندگی ہنس کے گزرتی تو بہت اچھا تھا
خیر ہنس کے نہ سہی رو کے گزر جائے گی
راکھ برباد محبت کی بچارکھی ہے
بار بار اس کو جو چھیڑا تو بکھر جائے گی

......☆☆☆......

جھکی جھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں
وہ پل کہ جس میں محبت جوان ہوتی ہے
اس ایک پل کا تجھے انتظار ہے کہ نہیں

......☆☆☆......

یونہی کوئی مل گیا تھا سر راہ چلتے چلتے
وہیں تھم کے رہ گئی ہے میری رات ڈھلتے ڈھلتے
شب انتظار آخر کبھی ہوگی مختصر بھی
یہ چراغ بجھ رہے ہیں مرے ساتھ جلتے جلتے

......☆☆☆......

تیرا حسن رہے میرا عشق رہے
یہ صبح یہ شام رہے نہ رہے
رہے پیار کا نام زمانے میں
کسی اور کا نام رہے نہ رہے

(''دو دل'')

ہو کے مجبور مجھے اس نے بلایا ہوگا

زہر چپکے سے دوا جان کے کھایا ہوگا

دل نے کچھ ایسے بھی افسانے سنائے ہوں گے

اشک آنکھوں نے پئے اور نہ گرائے ہوں گے

بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہونگے

ایک ایک لفظ جبیں پر ابھر آیا ہوگا!

(''حقیقت'')

تمہاری زلف کے سایۓ میں شام کرلوں گا

سفر اس عمر کا پل میں تمام کرلوں گا

جہان دل پہ حکومت تمہیں مبارک ہو

رہی شکست تو وہ اپنے نام کرلوں گا

ان مثالوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ فلمی گیتوں اور نغموں میں بھی کیفی کا اپنا منفرد انداز و اسلوب برقرار رہتا ہے۔ ان کے گیتوں میں ترقی پسندانہ رجحانات اور اردو شاعری کی روایت میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے، غزل اور تغزل کے ساتھ ساتھ ان کے نغموں میں نئے نئے استعارات و کنایات کا حسین امتزاج بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے، مثلاً:

دیئے کیوں جلائے چلا جا رہا ہے

اجالوں کو تیرے سیاہی نے گھیرا

نگل جائے گا روشنی کو اندھیرا

چراغوں کی لو پر دھواں چھا رہا ہے

دیئے کیوں جلائے چلا جارہا ہے

کیفی اعظمی کے فلمی نغموں کا انتخاب ۱۹۷۴ء میں ''میری آواز سنو'' کے نام سے شائع ہوا تھا اس کی ابتداء میں کیفی نے لکھا ہے کہ:

''شاید ان فلمی نغموں کو شائع کرنے والے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ سنگیت اور گانے والوں کی آوازوں سے الگ کرکے ان گیتوں میں کچھ بچتا بھی یا نہیں۔'' (۱)

اس داخلی شہادت (تجزیہ) سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیفی کے متعدد گیت اپنے خارجی لوازمات اور طمطراق کے باوجود بھی تاریخ کے حامل اور لائق مطالعہ ہیں۔ کیفی نے جب فلموں میں گیت لکھنا شروع کیئے تو ان کے مخالفین کے ساتھ ساتھ ان کے حامیوں کا ایک بڑا طبقہ بھی اسے ناپسند کرتا تھا، لیکن معاشی پریشانیاں اپنی جگہ تھیں، اپنے گیتوں کی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود انہوں نے اس کا خاطر خواہ تجارتی فائدہ نہیں حاصل کیا اور پارٹی سے اپنی وابستگی قائم رکھتے ہوئے ترقی پسند تحریک کے نہایت سرگرم کارکن بنے رہے ان کے متعلق ساحر لدھیانوی نے ایک موقع پر کہا تھا:

''موجودہ سیاسی اور انتظامی نظام کسی کو روزگار کی ضمانت نہیں دیتا، بے روزگاری کا الاؤنس یا بڑھاپے کی پنشن اور علاج معالجے کی سہولت نہیں مہیا کرتا............ اگر ایسا سیاسی اور سماجی نظام قائم ہوجاتا تو کیفی کو کمرشیل فلموں میں لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ وہ شاعری کرتے انسانوں کی نیچر کی عشق و محبت کی، اور مختلف کیفیات کی اور وہ سوشلسٹ سماج کی تعمیر میں ہاتھ بٹاتے کسان اور مزدور کے شانہ بشانہ۔'' (۲)

سبودھ لال لکھتے ہیں:

''کیفی نے اگر فلموں میں گیت نہ لکھے ہوتے تو بھی ان کی شخصیت مقبول ہی رہتی لیکن یقیناً فلمی دنیا اس رس اس حسن کو ترستی جو کیفی کی ہی دین ہے۔ اگر کیفی نے

---

(۱) کیفی اعظمی کی شاعری سبودھ لال ص ۵۰۲۔

(۲) کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی، اپنی کلاہ کج ہے اس بانکپن کے ساتھ۔ کیفی اعظمی کچھ یادیں، خلش جعفری ص ۲۰۴۔

فلموں کے علاوہ شاعری نہ کی ہوتی تب بھی ان کو ادب عزت کی نگاہ سے دیکھتا اور زمانہ ان کی آواز دھیان سے سنتا۔"(۱)

فلمی دنیا میں کیفی اعظمی کی شخصیت کے کئی پہلو کارفرما رہے ہیں۔ فلموں کیلئے وہ محض ایک گیت کار ہی نہیں بنے رہے، بلکہ انہوں نے گیتوں کے کہانی، مکالمے اور منظر نامے بھی لکھے ہیں، جن پر انہیں فلم فیر، نیشنل او رپریسیڈنٹ ایوارڈ بھی ملے۔ کہانی اور مکالمے کے تعلق سے ہیر رانجھا ایک یادگار اور منفرد فلم ہے، جس کے سارے مکالمے منظوم ہے، اس فلم کے بارے میں شاہ نواز قریشی لکھتے ہیں:

"یہاں ان کا سب سے بڑا کارنامہ فلم ہیر رانجھا میں ان کے منظوم مکالمے، اس کام کو انہوں نے یقیناً ایک چیلنج کی طرح لیا ہوگا اور بلاشبہ اس چیلنج کا سامنا انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ کیا۔ ہیر رانجھا ہندوستان کی پہلی ایسی فلم ہے، جس کے سارے مکالمے منظوم ہیں۔ یعنی اس فلم کے سارے کردار جو گفتگو کرتے ہیں وہ شاعری میں کرتے ہیں ان کا ہر جملہ ایک مصرعہ یا ایک شعر ہوتا ہے اور انہیں جواب بھی مصرعوں میں ہی ملتا ہے۔ اس فلم میں کیفی صاحب نے زبردست مہارت کا مظاہرہ کیا ہے او رہر جگہ انہوں نے معیار اور شعریت کو بھی برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔"(۲)

بلاشبہ فلمی حد بندیوں اور بندشوں کو قائم رکھتے ہوئے گیت، نغمہ یا غزل لکھنا اور ادبیت برقرار رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ فلمی شاعری میں جب ادبی معیار کی بات کی جائے گی تو کیفی اعظمی کا نام بطور حوالہ ضرو پیش کیا جائے گا۔ ان کے فلمی گیتوں میں جا بجا سماجی حقیقت نگاری اور جذبات واحساسات کی مختلف کیفیتوں کا حسین امتزاج ان کی شخصیت اور اسلوب شاعری کی انفرادی خصوصیات ہیں، جو فلمی گیت کار کی حیثیت سے ان کی مخصوص شناخت قائم کرتی ہیں۔

(۱) کیفی کی فلمی شاعری- سیودھ لال ص ۵۱۱۔

(۲) فکروفن اور شخصیت- کیفی اعظمی- اطہر نبی شاہ نواز قریشی- کیفی اعظمی بحیثیت فلمی نغمہ نگار ص ۱۴۴-۱۴۵ سہارا انڈیا پریوار ۱۹۹۴۔

باب پنجم

کیفی اعظمی کے مجموعی کلام کا تنقیدی جائزہ

کیفی اعظمی کو شاعری کا ذوق ورثے میں ملا تھا، گھر کا ماحول شاعرانہ تھا ان کے والد سید فتح حسین باقاعدہ شاعر تو نہیں تھے لیکن شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، کیفی کے یہاں آئے دن شعری نشستیں اور مشاعرے ہوا کرتے تھے، کیفی کے تین بڑے بھائی تھے، تینوں صاحب بیاض اور صاحب تخلص شاعر تھے سب سے بڑے بھائی سید ظفر حسین کا تخلص مجروح تھا، ان سے چھوٹے بھائی سید یوسف حسین کا تخلص بیتاب تھا، اور ان سے چھوٹے بھائی سید شبیر حسین وفا تخلص کرتے تھے۔ سید اطہر حسین رضوی جو کیفی اعظمی کے نام سے شہرت پذیر ہوئے اس ماحول اور شعری محافل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چونکہ کم عمر اور گھر میں سب سے چھوٹے تھے اس سے بھی بڑے ان سے پیار کرتے تھے خاص طور سے بڑی بہن واجدہ باجی کے بہت چہیتے تھے، چھ سال کی عمر سے واجدہ باجی رات کو سوتے وقت اپنے پاس لٹا کر میر انیس کے مرثیے سنایا کرتی تھیں اس لئے مرثیوں کے بہت سے حصے ان کو زبانی یاد ہو گئے تھے، گھر کی ادبی محفلوں میں وہ اپنی صغر سنی کی وجہ سے شامل نہیں ہو پاتے ان کا کام صرف چائے پانی سے مہمانوں کی تواضع کرنا تھا جو وہ خوشی خوشی انجام دیتے تھے، اس طرح زنان خانے اور مردانے میں آتے جاتے آہستہ آہستہ انہوں نے شعر کہنا بھی شروع کر دیا تھا۔ مگر کیفی تخلص انہیں اس وقت ملا، جب انہوں نے شاعری کا امتحان پاس کر لیا، جس کا مختصر سا قصہ یہ ہے کہ شروع میں جب کیفی نے اپنے بڑے کی سفارش سے اور ابا کی اجازت سے ایک غزل سنائی،

وہ سب کی سن رہے ہیں سب کو دادِ شوق دیتے ہیں
کہیں ایسے میں میرا قصۂ غم بھی بیاں ہوتا

اس پر انہیں محفل میں بہت داد ملی، تو ان کے والد کو شک ہوا کہ ان کے ساتھیوں میں سے کسی نے لکھ کر دی ہے، یہ بات کیفی کے لئے تکلیف دہ تھی یہ سن کر وہ اپنی بہن واجدہ باجی کے پاس پہونچے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور کہا:

''دیکھئے باجی میں ایک دن ہندوستان کا مشہور شاعر بنوں گا اور اس سے مجھے کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اس وقت تو ابا سمجھے ہیں کہ میری غزل شبیر بھیا نے کہہ کر دی ہے۔''(۱)

باجی نے گلے لگالیا اور حوصلہ بندھایا، شبیر بھائی کے کہنے پر کہ پڑھی گئی غزل انہیں کی ہے، ابا نے کہا کہ شک دور کرنے کیلئے کیوں نہ امتحان لے لیا جائے، حضرت شوق بہرائچی جو کیفی کے والد کے منشی اور مزاحیہ شاعر تھے، انہوں نے ایک مصرعہ دیا کہ اسی پر غزل کہو، مصرعہ تھا ''اتنا ہنسو کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے'' کیفی نے تھوڑی دیر میں غزل کہہ دی:

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکر نشیب وفراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے
ساقی سبھی کو ہے غم تشنہ لبی مگر
مے ہے اسی کے نام پہ جس کے ابل پڑے
مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہوگیا مگر آنسو نکل پڑے

---

(۱) کیفی اعظمی میرے ہم سفر۔شوکت کیفی، کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۲ء۔

غزل سن کر کیفی کے والد غرق حیرت ہو گئے، اور بہت خوش ہو کر اسی وقت انہوں نے اطہر حسین کو کیفی تخلص عطا کیا اور ایک شیروانی بھی دی، کیفی اس غزل کے متعلق کہتے ہیں کہ ''یہ میری زندگی کی پہلی غزل ہے، جو میں نے گیارہ سال کی عمر میں کہی تھی۔''(۱)

کیفی کا اس زمانہ کا کلام دست برد زمانہ سے اب محفوظ نہیں ہے، صرف یہی غزل اس لئے آج تک محفوظ ہے کہ بیگم اختر نے بقول شخصے ''اس میں آواز کا امرت گھول دیا ہے اور یہ غزل ہندوستان پاکستان میں مشہور ہوگئی۔''

کیفی اوائل عمری ہی سے حساس طبع ہونے کی وجہ سے لوگوں کی پریشانیوں ان کے دکھ درد فاقہ زدہ بدحال زندگی دیکھ دیکھ کر بہت متاثر ہوتے تھے اس وقت روس میں انقلاب آچکا تھا اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کسانوں اور مزدوروں کی حمایت کررہی تھی اور اس کا اخبار 'قومی جنگ' کیفی کے مطالعہ میں اکثر رہتا تھا، اس سے متاثر ہو کر ''قومی جنگ'' کیلئے روس کی حمایت میں نظمیں لکھ کر بھیجنے لگے، لیکن شروع میں ان نظموں میں نام اور پتہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس وقت کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری پی سی جوشی اور ترقی پسند انجمن کے اہم لیڈر سجاد ظہیر اور سردار جعفری وغیرہ کیفی کی نظموں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے ایک دن کیفی سلطان المدارس کے پھاٹک پر اسٹرائک کے دوران اپنی نظم سنا کر طلباء میں جوش پیدا کررہے تھے تبھی ان کی ملاقات علی عباس حسینی سے ہوگئی، وہ ان کو اپنے گھر لے گئے اور سید احتشام حسین سے انہیں متعارف کرایا۔ احتشام حسین نے انہیں سردار جعفری سے ملایا، جو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر تھے اس کے بعد کیفی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے اس طرح کیفی جو مولوی بننے کے لئے سلطان المدارس میں داخل ہوئے تھے، مولوی تو خیر نہ بن سکے لیکن کارل مارکس کے نظریے سے متاثر ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں ممبئی سے شائع ہونے والے کمیونسٹ اخبار قومی جنگ کی مجلس ادارت میں شامل ہو گئے اور پھر ہمہ وقتی طور پر ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقت رکن بن گئے اس

(۱) کیفی اعظمی میرے ہم سفر۔ شوکت کیفی، کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۲ء۔

طرح بقول عائشہ صدیقی:

''کیفی جو سلطان المدارس میں مولوی بننے کے خیال سے داخل ہوئے تھے،

وہاں سے وہ مذہب پر فاتحہ پڑھ کر نکل آئے۔''

غرضکہ مارکس کی تخلیقات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد کیفی ایک پکے کمیونسٹ بن گئے اور پھر کانپور سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے ممبئی پہونچ کر اپنی پوری زندگی ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کیلئے وقف کردی۔

کیفی کی شاعری کے اتار چڑھاؤ کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کو تین مختلف ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے جو قریب نصف صدی کے طویل عرصے پر محیط ہے، ان کا منتخب کلام ''جھنکار''، ''آخرِ شب''، ''آوارہ سجدے'' اور ان کی تمام شاعری کا انتخاب ''سرمایہ'' میں نظر آتا ہے۔ لیکن انتخاب میں ان کے کلام کا بہت زیادہ حصہ قلم زد کردیا پھر بھی کچھ حصہ مختلف رسائل اور گلدستوں اور نظموں کے مختلف انتخاب میں مل جاتا ہے ان کی شاعری کئی مراحل حیات اور بہت سے موڑ سے گزری، حسن وعشق کی رنگینی، فطرت کی دل کشی، رومانیت کی چاشنی سیاسی سماجی اور ہنگامی موضوعات کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی اور علامت نگاری کے عناصر کیفی کے شعری سفر کے مختلف مراحل ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری کو مختلف ناقدین فن نے مختلف ادوار میں بانٹا ہے، ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق ان کی شاعری کے دو ادوار ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''پہلا دور راست اظہار اور بیانیہ انداز ہے، جس کے نمونے جھنکار اور آخر شب میں بڑی تعداد میں موجود ہیں، دوسرا دور علامتی پیرائے اور حسیاتی اظہار کا ہے، یہی رنگ آوارہ سجدے کا ہے اور یہی آج کیفی اعظمی کی پہچان بنا ہوا ہے۔''(۱)

اسی طرح اصغر علی انجینئر بھی کیفی کی شاعری کو ڈاکٹر محمد حسن کی طرح دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں، ان کے خیال میں:

''کیفی کے پہلے دور کی شاعری (یعنی آخر شب تک کی شاعری) پارٹی پر ایمان کی

---

(۱) ساحر ادب کے پیش رو۔ ڈاکٹر محمد حسن ص ۹۴۔

شاعری تھی، جس میں کہیں کہیں ایمان فن پر حاوی ہوجاتا ہے، دوسرے دور کی شاعری (آوارہ سجدے والے مجموعے) تشکیک کی شاعری ہے۔"(۱)

لیکن پروفیسر مظفر حنفی ان دو آراء سے انحراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کیفی کے تخلیقی سفر میں ۱۹۴۵ء اور ۱۹۶۲ء خاصی اہمیت کے حامل ہیں اپنے خیال کی روشنی میں وہ ان کی شاعری کو درج ذیل تین ادوار میں بانٹتے ہیں:

(۱) از ابتداء تا ۱۹۴۵ء پہلا دور

(۲) ۱۹۴۵ء تا ۱۹۶۲ء دوسرا دور

(۳) ۱۹۶۲ء تا حال تیسرا دور (۲)

کیفی اعظمی کے کلام کے عمیق مطالعہ سے راقم الحروف اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ کیفی کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب کا تجزیہ درست ہے اور وہ حق بجانب ہیں کیفی کے دور اول کی شاعری کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ اس دور کی شاعری میں رومانیت کا غلبہ ہے یہ شاعری بہت ہی نرم مترنم اور نغمگی و شگفتگی سے معمور ہے، اپنی سبک رفتاری کے باوجود اثر پذیری سادگی اور جذبے کا خلوص لئے ہوئے ہے اس ابتدائی زمانے کی شاعری کے بارے میں نامی انصاری کا کہنا ہے:

> "ان کی ابتدائی غنائیہ نظمیں نوجوانی کے عاشقانہ اور رومانی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں اس دور کی نظموں میں جذبے کی صداقت اور گرمی پوری طرح موجود ہے، نوجوانی کے یہ جذبات ہر دور میں مشترک ہوتے ہیں، اور ایک عالمگیر صداقت رکھتے ہیں، اس لئے ان کو صرف سطحی رومانیت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"(۳)

کیفی کے اس دور کی نظموں میں بانسری کا لہرا، کہرے کا کھیت، برسات کی ایک رات، دوشیزہ مالن،

---

(۱) کیفی اعظمی کی شخصیت اور شاعری - اصغر علی انجینئر ص ۳۱۴ کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔

(۲) جہات و جستجو ڈاکٹر مظفر حنفی طبع اول ۱۹۸۲ ص ۱۱۴۔

(۳) آخر شب کے ہمسفر - نامی انصاری کیفی اعظمی عکس اور جہتیں - شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲۔

شام، پیتل کے کنگن، شباب، سویرے سویرے، تصادم، پہلا سلام، دھواں، تجدید، حوصلہ، تبسم، نرسوں کے محافظ، نغمگی، تم، تصور، ملاقات، پشیمانی، مجبوری، نصیحت، نقش ونگار اور احتیاط وغیرہ اس دور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ نظمیں رومانی شاعری کی اچھی مثالیں ہیں جن میں رومانی عشقیہ جذبات کے علاوہ مناظر فطرت کی اچھی تصویر کشی رومانی رنگ میں کی گئی ہے، اس سلسلے میں پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''ان میں خوبصورتی اور رنگینی کے ساتھ تلخی، کرب، مایوسی، شکست اور ناکامی بھی ہے، اور زندگی کا یہ دوسرا حصہ پہلے سے نسبتاً زیادہ ہے اس لئے کیفی کی نظمیں زندگی کے ان دونوں رخوں کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے زندگی کے اس کرب کو زیادہ قریب سے دیکھا تھا وہ ہر چہرے پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتے تھے، لیکن سماجی نابرابری اور ظلم نے چہروں سے مسکراہٹ چھین کر ان پر بھوک ناکامی اور نفرت کی تلخ لکیریں کھینچ دی تھیں۔ اس لئے کیفی بہت دیر تک اس رومانی اور تصوراتی فضا میں سانس نہیں لے سکے اور ان کا لہجہ تلخ تر ہوتا گیا۔''(۱)

کیفی کی شاعری کا دوسرا دور اس تلخی اور سماجی ناہمواری کے خلاف غم وغصہ کا اظہار ہے اور عام طور پر ان کے اسی دور کی شاعری کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں خطابت اور وقتی موضوعات کی شاعری کہا جاتا ہے۔ اس دور کی شاعری میں اشترا کی نظریات اور ترقی پسندانہ رجحانات کی واضح چھاپ نظر آتی ہے بادی النظر میں ترقی پسندانہ رجحانات، نظریات اور مارکسی تعلیمات کے اثرات ان کے ابتدائی دور کی تخلیقات میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن ۱۹۴۴ اور ۱۹۴۵ سے انہوں نے بالارادہ اپنی شاعری کا رخ سیاسی ہنگامی اور پھر وقتی قسم کی ترقی پسندانہ شاعری کی طرف موڑ دیا تھا، بقول مظفر حنفی:

''کیفی اعظمی نے دیدہ بینائے قوم کی حیثیت سے وقت کی نبض پہچان کر اپنے قلم کا رخ وقتی اور ہنگامی مسائل اور موضوعاتی نظموں کی طرف موڑ دیا اور ہر اس اہم سیاسی اور تاریخی واقعہ کو اپنی نظم میں ڈھالا، جو اس دور میں ان کے تئیں اہم نظر آیا۔''(۲)

---

(۱) کیفی: انسانی ہمدردی کا شاعر- پروفیسر شارب ردولوی ص ۳۳ کیفی اعظمی نمبر جولائی- اگست ۲۰۰۲ء

(۲) جہات وجستجو ڈاکٹر مظفر حنفی ص ۱۱۴ طبع اول ۱۹۸۲ء۔

غرضکہ کیفی کی شاعری کا دوسرا دور اس تلخی اور سماجی نابرابری کے خلاف غم اور غصہ کا دور ہے اور عام طور پر ان کے اسی دور کی شاعری کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں خطابت اور وقتی موضوعات کی شاعری کہا جاتا ہے۔ اس دور میں سیاسی حالات کو تھیم بنا کر لکھی گئی نظموں میں 'فیصلہ' 'تلاش' 'کب تک' 'آخری مرحلہ' 'نئے خاکے' 'کرن' 'سرخ' 'جنت' 'سویت یونین' اور 'ہندوستان' 'یلغار' 'فتح برلن' 'ہم آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں' وغیرہ اہم ہیں۔ یہ نظمیں ملکی اور بین الاقوامی سیاسی و ہنگامی واقعات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس موقع پر ترقی پسندانہ خیالات کو احتجاجی اور خطیبانہ انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ ناقدین فن کی رائے میں کیفی کی یہ شاعری سپاٹ اور بے لطف ہے، بہر حال نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی، ویسے تو یہ الزام پوری ترقی پسند شاعری پر عائد کیا جاتا ہے، جو کسی حد تک درست بھی ہے، لیکن مجموعی طور سے کیفی ایک کامیاب ترقی پسند شاعر ہیں اور ان کے یہاں ترقی پسندانہ شاعری کی بہترین مثالیں ہیں، جن میں نعرے بازی کے عناصر بہت کم ہیں، ان کی وقتی شاعری بھی کامیاب ہے، بقول ڈاکٹر محمد حسن:

> ''کیفی اعظمی نے وقتی موضوعات پر کامیاب نظمیں لکھنے کا تجربہ کیا۔''(۱)

مظفر حنفی کیفی کے دوسرے دور کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کیفی اعظمی کے یہاں بھی اشتراکی تصورات اور نظریات نے عقیدت کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور اسی لئے ان کی نظموں میں فکر، جذبہ، شدت، احساس اور زور بیان کے عناصر نے مل کر ہنگامی موضوعات کو بھی شعری قالب عطا کر دیا ہے، اس شدت احساس اور جذبے کی کارفرمائی نے کیفی اعظمی کی ترقی پسندانہ شاعری میں طنزیہ اسلوب کا جادو بھی جگا دیا ہے۔''(۲)

آزادی کے بعد حالات نے تیزی سے کروٹ لی سیاسی سماجی تبدیلیوں کا اثر اس دور کے ادبی تقاضوں پر بھی پڑا۔ آہستہ آہستہ ترقی پسند تحریک کی مقبولیت بھی کم ہونے لگی اور نئے دور میں نئے مسائل حیات اور نئی

---

(۱) ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ص ۹۸ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۹۴ء۔

(۲) جہات و جستجو ڈاکٹر مظفر حنفی ص ۱۱۴ طبع اول ۱۹۸۲ء۔

حسیت کے موضوعات شاعری کا حصہ بنے۔کیفی بھی ان بدلتے ہوئے حالات کا مشاہدہ کررہے تھے، لہٰذا ان کی شاعری میں بھی تبدیلی ہونے لگی۔اس سلسلے میں شارب ردولوی تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ہر زمانہ شاعری اور ادب کے لئے اپنے موضوعات لے کر آتا ہے اور زمانہ ہی اظہار کی ہیئتوں کا تعین کرتا ہے، ایک زمانہ تھا کہ شاعر کی عظمت کا تعین اس کی قصیدہ گوئی کی مہارت اور قدرت زبان کی بنا پر کیا جاتا تھا۔لیکن آج قصیدہ گوئی کو وہ اہمیت بھی نہیں جو پچاس سال پہلے تھی۔اب نہ دربار رہے اور نہ درباری شاعر اور نہ ملک الشعراء کے خطاب لیکن اس کے باوجود قصائد کی علمی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اسی طرح آزادی کی جنگ کے زمانے میں جس جس طرح کی نظمیں کہی گئیں ان کی آج ضرورت نہیں لیکن ان نظموں نے اپنے عہد میں جو کام انجام دیئے اور جس طرح عوام میں بیداری کی لہر پیدا کی اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ہوسکتا ہے کہ ان میں بہت سی نظمیں ادبی اہمیت کی نہ ہوں لیکن اس زمانے کی بیشتر نظمیں آج بھی دلوں میں گرمی جوش اور سرفروشی کی تمنا پیدا کرتی ہیں۔کیفی کی اس دور کی نظموں میں اکثر نظمیں آج بھی ہمارے لئے اہمیت رکھتی ہیں، ان کی سیاسی یا وقتی موضوعات کی شاعری کے بہت سے حصے آج کے حالات میں اپنی ایک نئی معنویت (Relevence) رکھتے ہیں۔''(۱)

اس ذکر میں وہ نظمیں شامل نہیں ہیں، جو لینن، سرخ سویرا، یا کسی حادثے پر لکھی گئی ہیں، کیفی کے سرمایے میں ایسی نظموں کی بہتات نہیں ہے، ان کی سیاسی یا موضوعاتی شاعری کو ان کے جمالیاتی موضوعات احساس اور فنی پختگی نے دلکش بنادیا ہے ان کی نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجئے، جسے سیاسی نظموں کے زمرے میں ہی رکھا جائے گا، جس کی پیکر تراشی رمزیت اور استعارے ان کے اعلیٰ جمالیاتی احساس کی ترجمانی کرتے ہیں:

آندھیاں توڑلیا کرتی ہیں شمعوں کی لویں
جڑ دیئے اس لئے بجلی کے ستارے ہم نے

(۱) کیفی انسانی دردمندی کا شاعر - پروفیسر شارب ردولوی ص ۴۴ کیفی اعظمی نمبر نیا دور جولائی - اگست ۲۰۰۲ء

بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورشِ تعمیر لئے
اپنی نس نس میں لئے محنت پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لئے
دن پگھلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیرے لئے
آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو میں بھی اٹھوں تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

(نظم ''مکان'' سے)

کیفی کی سیاسی اور ہنگامی موضوعات کی نظموں میں ان کی ایک نظم مژدہ ہے، جو انہوں نے شبلی نعمانی کی نظم ''امتحان کب تک'' سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ شبلی نعمانی کی نظم انگریزوں کے ظلم و زیادتیوں کے خلاف ایک غمزدہ دل کی چیخ ہے، جسے پڑھ کر آج بھی دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔ کیفی کی نظموں میں بڑا جوش اور حوصلہ ہے شبلی اور کیفی کی نظموں کا موضوع ایک ہی ہے لیکن دونوں میں مقصد کے حصول اور نظریہ جہات کا بہت فرق ہے، کیفی حق مانگنے کے بجائے حق چھین لینے کے حق میں تھے ان کی تضمین میں رجائیت اور تیقن اور حق چھین لینے کا حوصلہ ہے، جو فکر و عزائم کو مہمیز کرتا ہے یہ نظم اپنی فکر اور نظریہ کی توانائی اور اظہار کی قوت کی وجہ سے ہمیشہ دلوں میں گرمی اور جوش پیدا کرتی رہے گی، ملاحظہ ہو:

لیا ہے یہ سبق ہم نے خود اپنے خوں شدہ دل سے
ستم کی خو بدل سکتی نہیں فریادِ بسمل سے

تڑپ کر چھین لیں گے تیغ ہم اب دست قاتل سے
ہماری گردنوں پر اب نہ ہوگا امتحاں شبلی

......☆☆☆......

وہ گل شعلہ بنے جن پر ستم کروٹ بدلتا تھا
وہ رات آخر ہوئی جس میں چراغ ظلم جلتا تھا
ہمارا قصۂ غم سن کے جن کا جی بہلتا تھا
قریب ختم آپہونچی انہیں کی داستاں شبلی

(نظم ''مژدہ'')

بقول ڈاکٹر شارب ردولوی:

''کیفی کی نظم جن کے خلاف تھی، ان کی داستان ختم ہوگئی، ہندو دیو مالا میں ذکر آتا ہے کہ راکشش کے خون کی جتنی بوندیں گرتی ہیں اتنے ہی راکشش پیدا ہوجاتے ہیں اسی طرح سامراجی راکشسوں نے ہندوستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں فرقہ واریت اور دہشت گردی کی شکل میں نہ جانے کتنے راکشس پیدا کردئے جن سے آج انسانیت نبرد آزما ہے، کیفی کی یہ نظم دست قاتل سے تیغ چھین لینے کا جذبہ رکھتی ہے، عزم اور حوصلہ جگاتی ہے۔'' (۱)

کیفی کی شاعری کے تیسرے دور کی شاعری کو ہم انسانی دردمندی کی شاعری کا زمانہ کہہ سکتے ہیں، یہاں کیفی کا اسلوب قطعی منفرد ہے، نگاہ میں بالیدگی فکر میں گہرائی کے عناصر شامل ہونے سے کیفی نے شعریت کی زیریں سطح کو پالیا ہے، سید حامد حسین لکھتے ہیں:

''آوارہ سجدے تک پہونچتے پہونچتے کیفی اعظمی نے فنی کمال کے اس

---

(۱) کیفی انسانی دردمندی کا شاعر - پروفیسر شارب ردولوی - کیفی اعظمی نمبر نیا دور جولائی - اگست ۲۰۰۲ء

جوہر کو تلاش کرلیا ہے کہ کس طرح فنکار کا تخلیقی شعور عام تجربے کی علامتوں سے ایک پورے نظام فکر واحساس کے لئے ایک علامت عظمیٰ کی تعمیر کرسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی محسوس کرلیا کہ زندگی کی حقیقت ایک تہہ دار ایک پہلو دار اور پیچیدہ حقیقت ہے اس کا جامع اور بھرپور اظہار، متنوع اور رنگارنگ تجرباتی کیفیات اور تاثرات کی مدد سے ہی ممکن ہے۔" (۱)

کیفی کے اس تیسرے دور کی شاعری کے آثار ان کی ایک رومانی نظم "ایک بوسہ" سے ہی نظر آنے لگتے ہیں، جس کے متعلق خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

"اس دور میں ان کی ایک رومانی نظم "ایک بوسہ" شائع ہوئی، جس میں کیفی نے پھر شعریت کی روح کو چھولیا ہے۔" (۲)

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں
پھول کیا، شگوفے کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں
رقص کرنے لگتی ہیں مورتیں اجنتا کی
مدتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں
پھول کھلنے لگتے ہیں اجڑے اجڑے گلشن میں
پیاسی پیاسی دھرتی پر ابر چھانے لگتے ہیں
لمحے بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحے بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

---

(۱) آوارہ سجدے کی تخلیقی تشکیل۔ سید حامد حسین کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی ص ۲۸۵ معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۲۔
(۲) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۶۔

(ایک بوسہ)

کیفی کے اس دور کو ہم انسانی ہمدردی کی شاعری کا دور کہہ سکتے ہیں، کیمونسٹ پارٹی کی تقسیم اور کیمونسٹ حکومتوں کے زوال سے کیفی کو شدید کرب سے گزرنا پڑا لیکن جس طرح مایوسی اور ناکامی کسی فنکار کو اس کے معراج کمال تک پہونچا دیتی ہے، اسی طرح اس زخم نے کیفی کی شاعری میں ایک نیا آہنگ اور ولولہ پیدا کر دیا ہے، اس نظم کے چند اشعار دیکھئے، جن میں کرب و بے چینی اور شکستگی بھری ہوئی ہے:

اک یہی سوز نہاں کل میرا سرمایہ ہے
دوستوں میں کسے یہ سوز نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سر مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں

......☆☆☆......

اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو میرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں
راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور میرا راہ نما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا تھا
کہہ دیا عقل نے تنگ آ کے خدا کوئی نہیں

کمیونسٹ اکائی بکھرنے کے بعد کیفی نے خود اپنا راستہ چن لیا، جو دردمندی غربا نوازی اور انسان دوستی کا راستہ تھا، اس جگہ سے ان کی شاعری میں ٹھہراؤ آیا اس جملے سے یہ قطعی مراد نہیں ہے کہ ٹھہراؤ آ گیا یا

جمود اور تعطل کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ کیفی ایک باغی شاعر تھے اور ہمیشہ باغی رہے یہ طے ہے کہ جو شورش گھن گرج اور بغاوت کی خوبی ان کے یہاں تھی اس میں ضرور کمی واقع ہوئی، انسان، زندگی اور اسکے مسائل پر انہوں نے نئی طرح سے سوچنا شروع کیا۔ ابھی تک ان کے خیالات ونظریات عالمی سیاسی نظریہ کا حصہ تھے۔ یہ نظریات ان کے اپنے تھے: ''جز مرے اور میرا راہ نما کوئی نہیں'' اس امر کا برملا اعلان ان کے یہاں موجود ہے، اسی لئے محبت امن انصاف سماجی ناہمواری اور فرقہ واریت کے خلاف وہ آخر تک برسر پیکار رہے، اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ چلانے کے لئے کوشاں رہے۔

کبھی آگے کبھی پیچھے کوئی رفتار ہے یہ
ہم کو رفتار کا آہنگ بدلنا ہوگا
ذہن کے واسطے سانچے تو نہ ڈھالے گی حیات
ذہن کو آپ ہی ہر سانچے میں ڈھلنا ہوگا
یہ بھی جلنا کوئی جلنا ہے کہ شعلہ نہ دھواں
اب جلاویں گے زمانے کو جو جلنا ہوگا
راستے گھوم کے ہیں جاتے سب منزل کی طرف
ہم کسی رخ سے چلیں ساتھ ہی چلنا ہوگا

(نظم ''دعوت'' سے)

''دعوت''، ''نیا حسن''، ''ایک بوسہ''، ''نذرانہ پیار کا''، ''جشن اجنبی'' اور ''ایک لمحہ'' وغیرہ نظموں میں کیفی کی فکری گہرائی کے عناصر کی شمولیت صاف نظر آتی ہے اس کے ساتھ ساتھ کیفی نے عصری مسائل اور ترقی پسندانہ موضوعات پر جو نظمیں لکھی ہیں، ان میں نہرو دوسرا طوفان، پہرہ تاشقند، فرغانہ، ماسکو، لینن، بنگلہ دیش اور دھماکہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان موضوعاتی نظموں میں ''آخر شب'' کی طرح بلند آہنگی اور جذباتیت نہیں ہے بلکہ ایک تھمے تھمے طوفان کی کیفیت ضرور ہے۔ ''آوارہ سجدے'' کی وہ نظمیں، جو کیفی کی انفرادیت کی نقیب قرار

دی جاتی ہیں، ان میں مکان، آخری رات، عادت خاص ہیں۔ دائرہ، ابن مریم، دوپہر، بہروپنی، پیار کا جشن، گر بھ وتی، پیرتسمہ پا، کھلونے، انتشار ایک لمحہ زندگی اور چراغاں وغیرہ ہیں۔ یہ نظمیں حقیقت پسندی کے ساتھ ضبط وتحمل اور گہرائی فکر کی اچھی مثالیں ہیں۔ ان میں کیفی کے حساس دل اور کشادہ ذہن کے احساسات وتاثرات ان کی انفرادیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ آوارہ سجدے کے بعد کی نظموں میں بھی کیفی کا یہی رنگ وآہنگ ہے، وہ خود اپنے شعری تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''میری شاعری نے جوراستہ طے کیا ہے اس میں وہ مسلسل بدلتی اور نئی ہوتی رہی۔ بہت آہستہ آہستہ سہی آج وہ جس موڑ پر ہے اس کا نیاپن نہایت واضح ہے یہ رومانیت سے حقیقت پسندی کی طرف کوچ کا موڑ ہے، حقیقت پسندی کا یہ رجحان کسی خارجی اثر کا نتیجہ نہیں ہے اس کے آثار جھنکار اور آخر شب کی کچھ نظموں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔''(۱)

بہر حال کیفی کے اس قول سے انکار ممکن نہیں ہے کیونکہ شخصیت اور شاعری پر داخلی اور خارجی دونوں عناصر کارفرما ہوتے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ کیفی کی شاعری بدلتی اور نئی ہوتی ہوئی مختلف مراحل سے گزری ہے، جن میں یہ تین موڑ صاف دکھائی دیتے ہیں۔

کیفی ازل سے دردمند دل لے کر آئے تھے، لیکن ساتھ ہی ہر منزل ابتلاء وآزمائش یا غم وآلام میں ان کی امید قوی رہتی تھی وہ جنگ یا فسادات سے افسردہ وغمگین ہوجاتے خواہ وہ جنگ عراق یا فلسطین ہو یا اجودھیا میں مسجد کے انہدم کا واقعہ اور اس کے بعد فرقہ وارانہ خون خرابہ جس میں انسانی خون بے دریغ بہایا گیا یا دلتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی خونچکاں داستان۔ ایسے روح فرسا مناظر وواقعات کے موقعوں پر کیفی خود بھی اسی طرح زخم خوردہ انسان نظر آتے ہیں جیسے وہ مظلوم جن پر یہ پہاڑ ٹوٹے، کیفی حضرت عیسیٰ کے حضور ملتجی ہوتے ہیں:

---

(۱) کیفی اعظمی نئی تہہ داری کے شاعر- ڈاکٹر محمد حسن کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۲- ص ۱۱۲۔

جاؤ اک بار پھر ہمارے لئے

تم کو چڑھنا پڑے گا سولی پر

اور کبھی رام چندر جی سے ''دوسرا بن باس'' بیان کرتے ہیں پھر اس مایوسی کی تاریک فضا میں بھی وہ ہمیشہ قندیل امید روشن رکھتے تھے۔ بقول شارب ردولوی:

''کیفی وہ مجاہد ادیب ہیں جو نفرت، عداوت، ظلم، مذہبی عصبیت و تنگ نظری اور فرقہ واریت کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہے۔ آج بار باران کی نظم دوسرا طوفان کے یہ مصرعے ذہن میں گونجنے لگتے ہیں:

اک مجاہد ادیب

زندگی کیلئے

جو ہمیشہ مشیت سے لڑتا رہا

آدمی کے لئے

جو خدا کا گریباں پکڑتا رہا

لڑتے لڑتے وہ اک روز چپ ہو گیا

اپنے ہی اک صحیفے سے منہ ڈھانپ کے

سو گیا

لیکن اس کا قلم

جس کے سو نام ہیں

جس کے سو کام ہیں

لڑ رہا ہے اسی ڈھنگ سے آج تک

چل رہا ہے اسی رنگ سے آج تک

گاہ اس ہاتھ میں

گاہ اس ہاتھ میں

کیفی کا قلم بھی اسی طرح چلتا رہے گا اور نا انصافی اور تنگ نظری کے

ساتھ لڑتا رہے گا۔‘‘(۱)

کیفی کا تصور انقلاب:

بیسویں صدی کے نصف اول (تیسرے یا چوتھے دہے) میں جب حالی شبلی اور اکبر وغیرہ اردو شاعری کے ذریعے مشرق کو سر بلند کرنے اور اپنی قوم وملت کو خواب غفلت سے بیدار ہونے کا پیغام دے رہے تھے، اسی زمانے میں اردو شاعری کا ایک سر برآوردہ شاعر اقبال شاعری کو حکیمانہ عمل بنا کر پورے برصغیر بلکہ ایشیا کے انسانوں کی رگوں میں خون کو گرم کرنے اور اس کی گردش کو تیز کر رہا تھا۔ ایسے میں اردو شاعری کو شاعروں کی ایک اور نسل اور ان کی کاوشات کے سامنے آنا پڑا۔ ایک طرف رومانی شعراء دامن دل کو کھینچ رہے تھے اور دوسری جانب ۱۹۳۶ء میں اشتراکیت سے استفادہ کرنے والے فنکاروں کی ایک پوری نسل ترقی پسند تحریک کی صورت میں ابھری۔ اس تحریک میں بہت سے شاعر ایسے بھی شامل تھے، جو رومان وشباب کے سبزہ زاروں سے نکل کر ادب کا رشتہ انقلاب سے استوار کرنے اور سماجی حقائق کی ترجمانی کو اولیت دینے والے فنکاروں میں شامل ہوئے، کیفی اعظمی اسی حلقہ کے پر جوش اور بے پناہ تخلیقی شعور وفکر کے حامل فنکار تھے۔ ترقی پسند تحریک کے نقطہ آغاز کے وقت ان کی عمر محض ۱۸ سال تھی، اس وقت سے آزادی ملک کے وقت تک ان کے دو مجموعے ’’جھنکار‘‘ اور ’’آخر شب‘‘ شائع ہوئے، جو رومان اور انقلابی نظموں سے آراستہ ہیں اس زمانے تک پہونچتے پہونچتے وہ ایک کامیاب شاعر ہو چکے تھے، ان کی تخلیقات میں دیدہ زیب تراکیب دلکش وحسین استعارے صوتی آہنگ وضاحت اور روانی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، اشتراکی تحریک سے وابستگی اور ملک کی آزادی سے ان کے

(۱) ترقی پسند شاعروں میں کیفی اعظمی کی انفرادیت۔ مضمون نگار ڈاکٹر شارب ردولوی مشمولہ روزنامہ ’’آگ‘‘ لکھنؤ ۱۶ر ستمبر ۲۰۰۹ء۔

لگاؤ نے انہیں انقلاب آہنگ عطا کیا ان کے پڑھنے کا انداز دلکش اور سحر انگیز ہوتا تھا وہ ایسا سماں باندھتے تھے کہ بڑے بڑے مشاعروں پر چھا جاتے تھے۔ سجاد ظہیر نے اپنی خود نوشت سوانح عمری روشنائی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی متعدد کانفرنسوں اور عوامی جلسوں و مشاعروں کا حال لکھا ہے جس میں ان کے مطابق مجازؔ و ساحرؔ کے علاوہ سردار جعفری اور کیفیؔ اعظمی اپنی انقلابی نظموں سے مسحور کر دیتے تھے، بقول سجاد ظہیر:

''عوام اپنے دکھوں اپنی بے نام آرزؤں اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی تمناؤں کی تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوئے'' اور ہمارے شاعروں (کیفی اعظمی، سردار جعفری، ساحر وغیرہ) کی وہی نظمیں عوام میں سب سے زیادہ پسند کی جاتی ہیں، جو سیاسی، جمہوری یا انقلابی خیالات کا اظہار صاف براہ راست اور پراثر طریقے سے کرتی ہیں غنائیہ غزلیں اب بھی جاذبیت رکھتی تھیں لیکن مشاعروں میں تڑپ اور حرارت اچھی نظموں سے زیادہ پیدا ہوتی تھی، جن میں شعراء ظلم کرنے والوں پر کاری ضرب لگاتے تھے۔ ریا کاروں کا پول کھولتے تھے، جمہور کی اصل حالت کا موثر بیان کرتے تھے، اتحاد عمل اور جدو جہد کا پیام اور ایک ایسے آنے والے زمانے کی بشارت دیتے تھے، جس میں آزادی خوش حالی اور انصاف کا دور دورہ ہوگا۔''(۱)

اپنے مضمون میں سید عبدالباری آگے لکھتے ہیں:

''آج ہی کی طرح اس عہد میں بھی شاعروں سے عوام یہ توقع کرتے تھے کہ وہ جھوٹ حماقت اور ریا کاری پر بے دریغ حملے کریں۔ سجاد ظہیر ممبئی کے پنجابی مسلمانوں کی انجمن کے ہفتہ اقبال کا ذکر کرتے ہیں، جس میں جوشؔ، جگرؔ، حفیظؔ جالندھری کے علاوہ نوجوان ترقی پسند شعراء سردار جعفری، کیفیؔ اعظمی، مجروح اور ساحر بھی مدعو کئے جاتے اور ہزاروں کی تعداد میں عوام ان کی سیاسی نظموں پر وارفتہ ہو جاتے اور بار بار مطالبہ ہوتا کہ اور نظمیں سنائیں۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ سجاد ظہیر ۱۹۴۶ء کا بیان کرتے ہیں جب کہ احمد آباد میں ترقی پسند

(۱) کیفی کی شاعری اور ان کا تصور انقلاب۔ از ڈاکٹر سید عبدالباری مشمولہ کیفی مرتبہ ڈاکٹر شباب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ص ۵۷-۵۸-۲۰۰۶۔

مصنفین کی ایک کانفرنس میں یہ سب شعراء شریک تھے اور جوشؔ، مجروحؔ اور ساحرؔ کے علاوہ کیفیؔ سے بھی لوگوں نے بار بار پڑھوایا سورت کے ایک مشاعرے کا وہ ذکر کرتے ہیں ،سورت میں مشاعرہ کیفیؔ کے ہاتھ رہا اور لوگ با اصرار انہیں کو گھنٹے دو گھنٹے تک سنتے رہے۔ انہوں نے اپنی نظمیں بڑے زوردار اور پرخلوص انداز میں تحت الفظ سنائیں جس کے وہ اس وقت تک ماہر ہو گئے تھے اور جوان کے کلام کے اسی رنگ کیلئے موزوں بھی ہے۔ ہر نظم کے ختم ہونے پر جب اصرار ہوتا کہ وہ اور سنائیں تو کیفیؔ صاحب میری طرف دیکھتے تھے کہ کیا رائے ہے ایسے میں میری رائے قطعی یہ تھی کہ ترقی پسند شاعروں کو خندہ پیشانی سے حاضرین کے مطالبات پورے کرنے چاہئیں۔(۱)

کیفیؔ کا خیال تھا کہ حالات کے ساتھ خود کو بدلنا بڑی سعادت مندی ہے، وہ اپنے تیسرے مجموعہ کلام آوارہ سجدے کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''انسان ہمیشہ اپنے ماحول اور ماحول کے ساتھ اپنے آپ کو بدلتے رہنے کی کوشش کرتا رہے، میری شاعری کا موضوع یہی عظیم جدوجہد ہے۔'' (آوارہ سجدے)(۲)

کیفیؔ اعظمی کی شاعری کا سنہرا دور ہندوستان کی آزادی کے پہلے کے چھ سات سالوں پر مشتمل ہے جب کہ ملک کی سیاسی دھڑکنوں اور انقلابی حوصلوں کو انہوں نے شعر کا پیرہن عطا کیا۔ کانگریسی لیڈروں کی قلعہ احمد نگر میں نظر بندی پر انہوں نے نظم ''تلاش'' لکھی۔ گاندھی جناح ملاقات، فتح برلن، سروجنی نائیڈو، ریاست تراونکور کے مجاہدوں کا ترانہ، مولانا آزاد اور خضر حیات کی ملاقات ان کے موضوعات تھے۔ آخری مرحلہ مژدہ نئے خاکے، تربیت، نئی جنت، کرن، آزادی، لال جھنڈا اور قومی حکمراں اس عہد کی چند نظموں کے موضوعات ہیں اور ملک کی آزادی جب خوفناک اور خوں آشام مناظر لے کر آئی تو کیفیؔ بے قرار ہو اٹھے ان کی نظم ''مصالحت'' کے یہ اشعار دیکھئے، جن میں ان کی انسان دوستی اور اہل وطن کیلئے ان کا خلوص بھرپور

---

(۱) کیفی کی شاعری اور ان کا تصور انقلاب - از ڈاکٹر سید عبدالباری مشمولہ کیفی مرتبہ ڈاکٹر شہاب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ص ۵۷-۵۸-۲۰۰۶۔
(۲) آوارہ سجدے ''کیفیات'' کلیات کیفی اعظمی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۲۰۰۲ء

انداز میں ملتا ہے:

سحر کا مژدہ سنانے والو طلوع بے شک سحر ہوئی ہے
مگر وہ کس کام کی سحر جو چرالے کٹیاؤں کا اجالا
مصالحت کے سکوت میں ہمیں بغاوت کے ڈھل چکے ہیں
بدلنے اٹھے تھے جو مقدر وہ رہنما خود بدل چکے ہیں
کہاں مفادات حکمرانی کہاں تقاضائے رہنمائی
بڑھیں گے ٹھکرا کے رہبروں کو وہ قافلے اب جو چل چکے ہیں
دہائی جب وطن کی دے کر انہیں کچلنا ہے غیر ممکن
یہ قحط وافلاس کے بھنور جو حکومتوں کو نگل چکے ہیں
ہٹے نہ پیچھے قدم دلیرو کہ اب محافظ ہو تم نشاں کے
رکے نہ پائے طلب جوانو کہ سارے کانٹے نکل چکے ہیں

بقول پروفیسر مظفر حنفی ان کی فصاحت اور روانی انیس اور جوش کے درجے تک پہنچ جاتی ہے کیفی جس تہذیب کی آغوش میں پلے بڑھے تھے وہاں عظمت کردار کا یہ معیار تھا:

دیکھا نہ آنکھ اٹھاکے کبھی اہل درد نے
دنیا گزرگئی غم دنیا لئے ہوئے

جھنکار اور آخر شب کی متعدد نظموں سے غلامی پر ان کی بے چینی اور آزادی کے لئے ان کی تڑپ کا اظہار ہوتا ہے آزادی کی بشارت بھی سناتے ہیں تو ان کا انداز رجائیت سے بھرپور ہوتا ہے۔

نشانات ستم بھرا رہے ہیں
حکومت کے علم تھرا رہے ہیں
غلامی کے قدم تھرا رہے ہیں

غلامی اب وطن سے جا رہی ہے

اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

(نظم آندھی)

اسی زمانے میں کیفی سراپا انقلاب بن چکے تھے، ہندوستان کے بچے بچے کے دل میں بلند عزائم کے شعلے لپک رہے تھے، کیفی نے مغربی سامراج کے خلاف بغاوت طوفان کو بہترین الفاظ میں یوں پیش کیا ہے:

حصار باندھے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے

کھڑے ہیں ہند کے سردار سر اٹھائے ہوئے

بڑھے ہیں جھیلے ہوئے قید و بند کے آزار

اٹھے ہیں جنگِ خلافت کے آزمائے ہوئے

شجاع وحیدر و ٹیپو کی گود کے پالے

دلیر نانک ورنجیت کے سکھائے ہوئے

خمار بادۂ اقبال کا نگاہوں میں

لبوں پہ نغمۂ ٹیگور مسکرائے ہوئے

بقول ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی:

''کیفی صاحب جو ابتداء ہی سے مادر ہند کے محنت کشوں اور پچھڑے عوام کی حمایت کے جذبے سے سرشار تھے، انہوں نے اس تحریک سے وابستہ ہو کر ظلم واستبداد کے عشرت کدوں کو خاکستر کر دینے کے عزم سے اپنی نوک قلم سے سنان آتش افشاں کا کام لینا شروع کر دیا۔ ان کی اس زمانے کی نظموں میں عزم وحوصلہ کی گرج محسوس ہوتی ہے:

الٹ کر ایک ٹھوکر میں ستم کا راج رکھ دیں گے

اٹھا کر اپنی پستی کو سرِ معراج رکھ دیں گے

وہ اک گل کی حکومت تھی کہ گلشن لٹ گیا سارا

ہم اب کے غنچے غنچے کی جبیں پر تاج رکھ دیں گے

ہم اب کے تنکے تنکے کو چمن بندی سکھائیں گے

نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

(نئی جنت)

ایک دوسری نظم تلنگانہ میں حریت کی بازیافت کی فکر میں ان کا یہ تیور بھی ملاحظہ کیجئے:

ابھرتی انسانیت کی توہین ہے تشدد کی حکمرانی

جبین تاریخ پر ہے اک داغ آج کی مطلق العنانی

تمہارے ہمراہ فتح و نصرت تمہارے قدموں میں کامرانی

مجاہدو! وہ ہے راج دھانی

(نظم تلنگانہ)

کیفی صاحب کی اس للکار کو محض کھوکھلی نعرہ بازی کا نام نہیں دیا جا سکتا، ان کو پورا پورا یقین ہے کہ:

لٹنے ہی والا ہے دم بھر میں حکومت کا سہاگ

لگنے ہی والی ہے جیلوں دفتروں تھانوں میں آگ

مٹنے ہی والا ہے خوں آشام دیو زر کا راج

آنے ہی والا ہے ٹھوکر میں الٹ کر سر سے تاج

چھٹنے ہی والی ہے ظلمت رہنے ہی والا ہے نور

ملنے ہی والی ہیں قبریں پھنکنے ہی والا ہے صور(۱)

اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی آگے لکھتے ہیں:

---

(۱) کیفی اعظمی ایک عوام دوست شاعر- از ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی مشمولہ کیفی مرتبہ ڈاکٹر شباب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۶ ص ۲۲۹۔

"کیفی صاحب نے اپنی شاعری کا آغاز رومان کی دلفریب اور رنگین وادیوں سے کیا تھا تصور، ملاقات، اندیشے، نقش ونگار، اور اسی قبیل کی دوسری نظمیں اپنی تازگی او رتاثر کی بنیاد پر دیدہ ودل کو کھینچتی ہیں۔لیکن جب وہ رومان سے سیاست کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو اسی رومانی شاعر کا رومانی لہجہ مروجہ نظام کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کے اظہار میں شعلہ بار ہوجاتا ہے۔"(۱)

آگے لکھتے ہیں:

"کیفی اعظمی اشتراکیت پر یقین رکھتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ اگر ہندوستان میں اشتراکیت کامیاب ہوگئی تو فرقہ واریت تعصب اور تنگ نظری کی وباؤں سے ملک پاک ہوجائے گا لیکن یہ تحریک بار آور نہ ہوسکی اس کا انہیں شدت سے احساس تھا اس کے علاوہ ۱۹۴۷ء سے اب تک ملک میں مذہبی عصبیت اور انتہا پسندی نے جو بھیانک روپ دکھایا ہے اس تناظر میں ان کی نظمیں بہروپنی ان کے درد وکرب کا کھلا ہوا اظہار ہیں، تقسیم ملک کے موقع پر ہونے والی خوں ریزیوں اور غارت گریوں اور دھرم کے نام پر ہونے والے فسادات سے بے چین ہوکر وہ تڑپ اٹھتے ہیں اپنی نظم خانہ جنگی میں انہوں نے دیش واسیوں کو ہدف ملامت بناتے ہوئے اپنی بے چینیوں کو یوں ظاہر کیا ہے:

سوکھتی ہے پڑوسیوں سے جان
دوستوں پر ہے قاتلوں کا گمان
لوگ گھر سے نکلتے ڈرتے ہیں
راستے سائیں سائیں کرتے ہیں
شہر ویراں ہیں بند ہیں بازار
اینڈتا ہے فضا میں گرم غبار

(۱) کیفی اعظمی ایک عوام دوست شاعر۔از ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی مشمولہ کیفی مرتبہ ڈاکٹر شباب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۶ ص ۲۲۹۔

فطرت شرع میں فساد نہیں

رہزنی داخل جہاد نہیں

کہہ کے تکبیر باندھ کر نیت

ماؤں بہنوں کی لوٹ لی عزت

گیت گا کر مہاتما جی کے

پیٹ ماؤں کے چاک کر ڈالے

لاش علم وادب کی حکمت کی

لاش کلچر کی آدمیت کی

ہو کہاں فتنہ دوست راہبرو

آؤ لاشیں ذرا شمار کرو

لو محمد علی کی لاش ہے یہ

لو تلک سے بلی کی لاش ہے یہ

آفریں ہندوٗ مسلمانو

لیگ کے کانگریس کے پروانو

خون کے یک ایک قطرے کا

تم نے اپنوں سے لے لیا بدلا

لیکن اس سے ملا سکے نہ نگاہ

کردیا جس نے زندگی کو تباہ

کیفی کی شاعری زندگی سے عبارت ہے ان کا آہنگ ان کے پختہ شعور کی دین اور ایک حساس اور بیدار ذہن کی اپج ہے کیفی صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے کبھی تخت وتاج

اور ظلم واستبداد سے ہاتھ نہیں ملایا اور ایک درویشانہ زندگی گزار کر چلے گئے۔"(۱)

بقول پروفیسر علی احمد فاطمی:

"نظیر اکبر آبادی سے لیکر کیفی اعظمی وامق جونپوری تک کی عوامی اورانقلابی شاعری کو سمجھنے کیلئے اردو تنقید کو ابھی کروٹ لینا ہے اسی لئے ہمارے یہ شعراء اردو تنقید کے معیاری چم خم پر نہیں بلکہ عوامی تفہیم وتعبیر اور اس کے کیف وکم پر زندہ ہیں۔"(۲)

کیفی نے ایک بیدار حساس اور باغی نوجوان کی حیثیت سے اپنے زمانے کے ایک خاص انداز سے سوچنے والے باغی نوجوانوں اور کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کا تھا، یہ تصور اس عہد کے ترقی پسندانہ نظریات کی نمائندگی کرتا ہے۔

کیفی کی شاعری میں عورت

قدیم اردو شاعری میں عورت محض متاع کوچہ و بازار اور سرمایہ تسکین طبقہ مذکور نظر آتی ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد جب حالات ومسائل بدلے، نفس پرستی اور عیش کوشی کا دور ختم ہوا، آزاد اور حالی کی اصلاحی تحریک اور انجمن پنجاب کے قیام کے بعد ادب میں نئے رجحانات داخل ہوئے تو رفتہ رفتہ عورت کا تصور بھی واضح ہونا شروع ہوا۔ جدید عورت کا تصور ترقی پسند تحریک کے ساتھ ابھرا اور اسے اس کے حقیقی روپ میں پیش کرنے کی کوشش۔ جاں نثار اختر، مجاز، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری کے علاوہ مختلف دوسرے شعراء نے کی۔ کیفی اعظمی ترقی پسند شعراء میں اہم مرتبہ پر فائز ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں بھی عورت کا ایک مخصوص تصور نظر آتا ہے۔ ان کی زندگی کی تیرہ وتار شب وجود وزن ہی سے روشن اور منور ہے۔ اپنے دوسرے مجموعے آخر شب میں "ش" کے پس پردہ شوکت سے کہتے ہیں:

---

(۱) کیفی اعظمی انسان دوست شاعر ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی مشمولہ کیفی مرتبہ ڈاکٹر شباب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۶ ص ۲۳۰۔

(۲) عوام انقلاب کا شاعر کیفی اعظمی پروفیسر علی احمد فاطمی مشمولہ کیفی مرتبہ ڈاکٹر شباب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۶ ص ۷۸۔

میں اپنے فن کو تنہا آخر شب تک لا چکا ہوں تم آ جاؤ تو سحر ہو جائے۔"(۱)

چنانچہ شوکت بیوی بن کر ان کی زندگی میں داخل ہوئیں اور اس طرح سحر ہو گئی جھنکار اور آخر شب سے آگے بڑھ کر آوارہ سجدے کی منزل کو چھوتے چھوتے کیفی کی شاعری میں عورت کا پیکر اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے، آوارہ سجدے کے انتساب میں لکھتے ہیں:

شوکت کے نام

ایسا جھونکا بھی ایک آیا تھا کہ دل بجھنے لگا
تو نے اس حال میں بھی مجھ کو سنبھالے رکھا
کچھ اندھیرے جو مرے دم سے ملے تھے تجھ کو
آفریں تجھ کو کہ نام ان کا اجالے رکھا
میرے یہ سجدے جو آوارہ بھی بدنام بھی ہیں
اپنی چوکھٹ پہ سجالے جو تیرے کام کے ہوں

کیفی عورت کو حسن مجسم تصور کرتے ہیں اردو شاعری میں سراپا نگاری کی بہت سی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن کیفی کی کئی نظموں میں عورت کے حسن کی ایسی تصاویر اور پیکر نظر آتے ہیں، جو کسی مصور یا سنگ تراش کے بس کا کام نہیں یہی وہ منزل ہے، جہاں شاعری دیگر فنون لطیفہ سے زیادہ مکمل نظر آتی ہے، مثال کے طور پر نظم تصور میں عورت کا سراپا زبان و نظر کیفی اعظمی ملاحظہ کیجئے:

یہ جسم نازک، یہ نرم بانہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو

---

(۱) آوارہ سجدے "کیفیات" کلیات کیفی اعظمی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۲۰۰۲ء

گلابی لب، مسکراتے عارض، جبیں کشادہ، بلند قامت

نگاہ میں بجلیوں کی جھل مل، اداؤں میں شبنمی لطافت

دھڑکتا سینہ، مہکتی سانسیں، نوا میں رس، انکھڑیوں میں امرت

ہمہ حلاوت، ہمہ ملاحت، ہمہ ترنم، ہمہ نزاکت

(نظم تصور)

عورت کے سراپا کے بیان میں کیفی کا ذوق شاعرانہ اور تشبیہات واستعارات کا استعمال نسوانی حسن میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ یہاں عورت کی ذات صرف بہار ہی نہیں بلکہ حاصل بہار اور لطافت و شگفتگی کا شاہکار بن جاتی ہے۔

شگفتگی کا لطافت کا شاہکار ہو تم

فقط بہار نہیں حاصل بہار ہو تم

جو ایک پھول میں ہے قید وہ گلستاں ہو

جو اک کلی میں ہے پنہاں وہ لالہ زار ہو تم

خدا کرے کسی دامن میں جذب ہو نہ سکیں

یہ میرے اشک حسیں جن سے آشکار ہو تم

......☆☆☆......

چشم بد دور یہ قد بالا

جیسے مشرق سے صبح نو کا ابھار

بیل جاتی ہوئی منڈیروں پر

دھوپ چڑھتی ہوئی سر دیوار

تمام تر ہندوستانی اوصاف کا حامل سانولا، سلونا نسوانی سولہ سنگار کیے، ہاتھوں میں چوڑیاں، جوڑے میں

پھول سجائے شرمایا، لجایا اور سہا ہوا ان کا موضوع شاعری بنتا ہے:

بسنتی ساڑی میں چھپا ہوا سادہ جواں بدن
جواں بدن پہ ریشمی بہار لے کے آئی تھی
وہ صندلی کلائیاں وہ سبز وسرخ چوڑیاں
سہاگ لے کے آئی تھی سنگھار لے کے آئی تھی

قدیم اردو شاعری میں عورت کی چال کو قیامت کے فتنے یا ناگن سی چال وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔لیکن کیفی نے جو توجیہ پیش کی ہے وہ بے مثال ہے، ملاحظہ کیجئے:

مرحلے جھیل کے نکھرا ہے مذاق تخلیق
سعی پیہم نے دئے ہیں یہ خدو خال تجھے
زندگی چلتی رہی کانٹوں پہ انگاروں پر
جب ملی اتنی حسین اتنی سبک چال تجھے

کیفی کے نزدیک عورت رقص وموسیقی کی جان ہے، یہ دونوں چیزیں عورت کی ذات میں جمع ہو کر ایک ایسا اچھوتا اور پاکیزہ تصور عطا کرتی ہیں کہ وہ بنت مریم بن کر ابھرتی ہے جس میں تقدس، دلکشی، عقیدت، پوجا اور عبادت کی سی کیفیت نظر آتی ہے:

آواز تری جس طرح جگنو چمک جائے کوئی
یا صبح کی آغوش میں غنچہ چٹک جائے کوئی
موجوں کے آئینے میں یا موتی جھلک جائے کوئی
ساغر چھلک جائے کوئی
اے بنت مریم گنگنا
اے جان نغمہ گائے جا

کیفی کے نزدیک عورت از سرتا محبت ہے اور محبت ہی ہر درد کا مداوا ہے اس کی ہر ادا شاعر کو لبھاتی اور سرشار کرتی ہے اس کی پرکشش آواز کی نغمگی روح کی گہرائیوں میں اتر کر دل کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور شاعر اپنے وجود سے بے خبر ہو جاتا ہے اور جب عورت مغنیہ کی شکل میں سامنے آتی ہے تو اس کا پورا وجود سراپا نغمہ بن جاتا ہے اور شاعر اسی نغمگی سے مسحور ہو کر اپنے دکھ درد سب بھول کر ایک پر کیف وادی میں پہونچ جاتا ہے، مغنیہ کے یہ اشعار دیکھئے:

نگاہ نغمہ خرام نغمہ کلام نغمہ پیام نغمہ
ہوا میں نغمے سمو رہی تھی فضا میں نغمے گھلا رہی تھی
سلونے ہونٹوں کی لرزشوں میں تھی پر فشاں روح میکدے کی
نظر کی سرشاریوں میں تخیل سامری تھرتھرا رہی تھی

کیفی کی ندرت فکر اور تازگی ان کی شاعری میں ایک نئی روح پھونک دیتی ہے ان کا محبوب جب نغمہ زن ہوتا ہے تو خود ایک ساز بن جاتا ہے جسے عاشق کی نظریں چھیڑتی ہیں اور اس کا وجود سراپا راگنی ہو جاتا ہے نظم ''تم'' کے یہ دو مصرعے دیکھئے:

تمہارے جسم میں خوابیدہ ہیں ہزاروں راگ
نگاہ چھیڑتی ہے جس کو وہ ستار ہو تم

ڈاکٹر سرفراز نواز کیفی کی رومانی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیفی نے عورت کے حسن کو ایک نیا انداز بخشا ہے، یہ ان کے حسن کی پرستار نظر ہی ہے، جو عورت کے رخ پر پڑتے ہی اسے مجسم دیوی بنا دیتی ہے اور وہ عورت کی آواز کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتارتے ہیں تو وہ مجسم نغمہ بن جاتی ہے۔ کیفی کی جدت عورت کے کردار کو پوری پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ شاعری کے کینوس پر ابھارنے میں مضمر ہے، وہ اپنی شاعرانہ نگاہ سے عورت کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اپنی نظم دوشیزہ مالن میں عورت کا

ایک مصور کی نظر سے جائزہ لیتے ہیں اور الفاظ کی جادوگری سے شاعری کے کینوس پر اس کی دلکش تصویر پیش کرتے ہیں:

مستی میں رخ پہ بال پریشاں کئے ہوئے
بادل میں شمع طور فروزاں کئے ہوئے
ہر سمت نقش پا سے چراغاں کئے ہوئے
آنچل کو بار گل سے گلستاں کئے ہوئے
لہرا رہی ہے باد سحر پاؤں چوم کے
پھرتی ہے تیتری سی غصب جھوم جھوم کے
زلفوں میں تاب سنبل پیچاں لئے ہوئے
ہونٹوں میں آب لعل بدخشاں لئے ہوئے
آنکھوں میں روحِ بادۂ عرفاں لئے ہوئے
ہونٹوں میں آبِ لعل بدخشاں لئے ہوئے
فطرت نے تو ل تول کے چشم قبول میں
سارا چمن نچوڑ دیا ایک پھول میں(۱)

کیفی کا عشق جوان کے دردمند دل سے اٹھتا ہے بہت ہی حساس اور خوددار ہے وہ محبوب کے پاس سے یہ سوچ کر اٹھتے ہیں کہ وہ شاید روک لے منالے اور جب وہ اسے مایل بہ کرم نہیں پاتے تو اس پر لعن طعن کرنے کے بجائے خود پشیمان ہو جاتے ہیں یہ جذبہ ایک حساس دل عاشق کا ہی شیوہ ہے:

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منالے گی مجھ کو

---

(۱) کیفی کی رومانی شاعری۔ڈاکٹر سرفراز نواز مضمون مشمولہ کیفی مرتبہ ڈاکٹر شباب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ص۲۲۰-۲۰۰۶۔

ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن
کہ دامن پکڑ کر بٹھالے گی مجھ کو
قدم ایسے انداز سے اٹھ رہے تھے
کہ آوز دے کر بلالے گی مجھ کو

......☆☆☆......

مگر اس نے روکا نہ مجھ کو منایا
نہ دامن پکڑ کر ہی مجھ کو بٹھایا
نہ آواز ہی دے کے مجھ کو بلایا
میں آہستہ آہستہ ہی بڑھتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جدا ہوگیا میں

کیفی نے ہر طرح سے ہر جتن سے یہ چاہا کہ ان کا محبوب انہیں روک لے مگر جب ہر اشارہ ناکام ہوگیا تو الگ ہوکر وہ اس پر لعن طعن اور اس سے شکوہ نہیں کرتے بلکہ اپنی جگہ پر یہ سوچ کر پشیمان ہوجاتے ہیں:

وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

کیفی کو عورت کی بے عزتی اور بے حرمتی برداشت نہیں۔ سر بازار عورت کی تذلیل کا منظر دیکھ کر وہ بے چین ہوجاتے ہیں اور جھنجھلا کر کہتے ہیں:

تو جہاں تھی اسی جنت میں نکھرتا ترا روپ
اس جہنم کو بسانے کی ضرورت کیا تھی

کیفی کے نزدیک عورت کا صحیح مقام بازار نہیں بلکہ گھر ہے وہ گھر کی رونق ہے، یہی مذاہب عالم کا فرمان بھی ہے، بموجب قرآن "**قرن فی بیوتکن**" (عورتیں گھروں کے آنگن میں ٹھہری رہیں) یجروید

ادھیائے ایک سوتر میں لکھا ہے ''استریا اپنے گھروں میں اچل رہی ہیں'' دونوں مفاہیم ایک ہی ہیں لیکن اس فرمان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت چہار دیواری میں نظر بند کردی جائے، وہ آزادی نسواں کی حمایت کرتے ہیں اور اس خیال سے متنفر ہیں، جس نے عورت کو صدیوں تک غلامی کی زنجیروں میں الرجال قوامون علی النساء کی غلط تاویل سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ ہر منزل حیات میں عورت کو مرد کے دوش بدوش دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کی صلاحیتوں سے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں

اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ میری جان میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں

اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ میری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تعلیم یافتہ اور بیدار عورت کیفی کے نزدیک وقار انسانیت اور تہذیب کا شاہکار ہے عورت کی اسی بیداری کو نذرانہ سلام پیش کرتے ہیں:

حوصلے جاگ اٹھے سوز یقیں جاگ اٹھا
نگہ ناز کے بے نام اشاروں کو سلام
تو جہاں رہتی ہے اس ارض حسین پر سجدہ
جن میں تو ملتی ہے ان راہ گزاروں کو سلام

یہی بیداری اور تعلیم سے مزین عورت جب ماں کا روپ دھار لیتی ہے اور سروجنی نائیڈو جیسا کردار اختیار کر لیتی ہے تو شاعر ایسی ماں کی خدمت میں یوں خراج پیش کرتا ہے:

ذرا زمین کو محور پر گھوم لینے دے
یہ دنیا تجھ سے ترا سوز وساز مانگے گی
جمال سیکھے گا خود اعتماد یاں تجھ سے
حیات نو ترے دل کا گداز مانگے گی

اور جب یہی عورت بہادر بیٹی بن کر نمودار ہوتی ہے اور عظمت فن وکردار کی شناخت بن جاتی ہے تو شاعر شفیق وہمدرد باپ کی حیثیت سے بیٹی کو زندگی کی کامرانیوں کی دعا دیتا ہے:

اب اور کیا ترا بیمار باپ دے گا تجھے
بس اک دعا کہ خدا تجھ کو کامیاب کرے
وہ ٹانک دے ترے آنچل میں چاند اور تارے
تو اپنے واسطے جس کا بھی انتخاب کرے

کیفی کی یہ دعا صرف سروجنی نائیڈو یا شبانہ اعظمی کے لئے نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کیلئے ہے۔ اس عقیدت کا اظہار اس وقت بھی کیفی کے یہاں نظر آتا ہے، جب تلنگانہ میں بغاوت کا پرچم بلند ہوتا ہے اور مردوں کے ساتھ عورتوں کو اس جنگ آزادی میں مردوں کا برابر کا شریک دیکھ کر وہ جھوم جھوم کر کہتے ہیں:

ضعیف مائیں جوان بہنیں جھکے ہوئے سر اٹھا رہی ہیں
سلگتی نظروں کی آنچ میں بھیگی بھیگی پلکیں بچھا رہی ہیں
لہو بھری چولیوں پھٹے آنچلوں سے پرچم بنا رہی ہیں
ترانہ جنگ گا رہی ہیں

فسادات کے زمانے میں عورتوں پر جو گزرتی ہے اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

اے بہار ان کو کچھ تسلی دے
بہنیں روتی ہیں بھائیوں کیلئے
غم میں بچوں کے جاں گنواتی ہیں
مائیں سو سو پچھاڑیں کھاتی ہیں
تیری روحانیت کا کیا کہنا
تو نے بچوں کا خون چوس لیا
گیت گا کر مہاتما جی کے
پیٹ ماؤں کے چاک کر ڈالے
دل میں بہنوں کے گاڑ کر بھالا
منہ کیا ملک وقوم کا کالا
خوب اپنوں سے انتقام لیا
جاتے دشمن کا پاؤں تھام لیا

عورت کی بے حرمتی ناقدری اور ارزانی سے کیفی ملول ہوتے ہیں اور وہ اس ملک وقوم سے نفرت کرتے ہیں، جہاں عورت کی عصمت وآبرو محفوظ نہیں وہ فتح برلن سے اس لئے خوش ہیں کہ انہیں امید ہے کہ اب وہاں ان کی عزت محفوظ ہو جائے گی اور ان کو سماج میں ان کا جائز حق مل جائے گا۔

کہہ دو اب اٹھ کے جلائیں دیویاں گھی کے چراغ
مٹ گئے جو توڑتے پھرتے تھے عصمت کے ایاغ

کیفی آزادی نسواں کے قائل ہیں، عورت کی آزادی اسے اپنی ذات سے آگہی اور واقفیت دلاتی ہے، اور نیک و بد میں تمیز کرنے کے قابل ہو جاتی ہے کیفی کا خیال ہے کہ نوجوان لڑکیوں کو ایک حد تک آزادی ضرور ملنا چاہئے کیونکہ پابندیاں ساری صلاحیتیں صلب کر دیتی ہیں:

یہ تتلیاں جنہیں مٹھی میں بھینچ رکھا ہے
جو اڑنے پائیں تو الجھیں کبھی نہ خاروں سے
تری طرح کہیں یہ بھی نہ بجھ کے رہ جائیں
تپش نچوڑ نہ ان ناچتے شراروں سے

پروفیسر قمر رئیس کے مطابق:

''کیفی نے عورت اور محبوبہ کا ایک نیا تصور اردو شاعری کو دیا۔ مردوں کی حاکمیت کے سماج میں عورت کو عیش و نشاط کا وسیلہ بنانے کے لئے نہ صرف رسموں اور واہموں کی زنجیروں میں جکڑا گیا ہے بلکہ اسے خالی احساس نزاکت احساس عظمت اور احساس محبت کا قیدی بنایا گیا۔ کیفی کے حقیقت پسندانہ شعور نے اسے رواجی تصور یا Myth کو بڑے موثر ڈھنگ سے توڑ دیا ہے۔''(۱)

کیفی کی شاعری میں عورت کے تصور کے متعلق خلیل الرب لکھتے ہیں:

''کیفی اعظمی نے عورت کا جو ارفع و اعلیٰ تصور پیش کیا ہے، اور عورت کے جلال و جمال کا اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ جو پیکر تراشا ہے اردو ادب میں وہ بے مثال ہے کیفی کے تصور عورت کسی خاص ملک و مذہب فرقہ یا طبقہ یا دور سے تعلق نہیں رکھتی اس کی اپنی انفرادیت اور آزادانہ وجود ہے۔''(۲)

---

(۱) کیفی اعظمی کی تخلیقی فکر کا سفر۔ قمر رئیس کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۲ص ۱۳۲۔
(۲) کتاب نما دہلی ستمبر ۱۹۹۵ء ص ۴۳م۔

بقول حقانی القاسمی:

''کیفی اعظمی کا سیاسی معاشی جغرافیہ خواہ کچھ بھی رہا ہو مگر مساوات ان کا ایسا شعری جغرافیہ اور فکری منطقہ ہے، جس کی سیر کر کے دلوں میں درد انسانی کے چراغ جلنے لگتے ہیں۔عورت ان کی ایک ایسی نظم ہے، جس کا فاعلی اور فکری عنصر مساوات سے عبارت ہے، یہ نظم انسانی خدوخال انسانی سوچ کے ملک گیر میں گتھی ہوئی ایسی نظم ہے، جہاں آدم وحوا کا کوئی امتیاز نہیں۔''(۱)

ترقی پسند شاعری اور زبان واسلوب

ترقی پسند تحریک نے اشتراکی نظریات کے تحت ادب میں فکری تبدیلی اور مواد واسلوب پر زیادہ زور دیا اسلوب کو محض اظہار کا وسیلہ سمجھ کر ضمنی یا ثانوی حیثیت دی۔ادب میں صرف مواد پر ہی انحصار کیا گیا یہ ایک انتہا پسندانہ خیال تھا ان لوگوں کے نزدیک جو فن پر زیادہ توجہ دیتے ہیں وہ رجعت پسند ہیں، اس مقصدیت کے تحت ان لوگوں نے روزمرہ کی زبان استعمال کی خطابت بلند آہنگی زور شور گھن گرج ترقی پسند اسلوب کے نمایاں عنصر میں تھے، اس کا سب سے پہلا فرض عوام الناس تک اپنی بات پہنچانا تھا وہ عوامی زندگی کے مسائل کا احساس عام کرانا چاہتے تھے۔

بقول سردار جعفری:

''شعر کی جتنی زبان بول چال کے قریب ہوگی اتنی ہی آسان ہوگی۔تشبیہ و استعاروں کی بھی بڑی اہمیت ہے اگر وہ محض روایتی اور فرسودہ نہ ہوں اور زندگی اور گردوپیش کے ماحول کیلئے کئے گئے ہوں تو وہ شعر کو آسان اور عام فہم بنادیتے ہیں۔''

چنانچہ ترقی پسند شاعری میں مواد کو بنیادی اور اسلوب کو ثانوی حیثیت حاصل رہی اس وجہ سے ترقی پسند شاعری کا زیادہ تر سرمایہ بیانیہ ہے، ترقی پسند شاعری میں ایسے اسلوب پر زور دیا گیا، جو اجتماعی ہو اس طرح

(۱) جلال جمال کا پرکیف امتزاج از حقانی القاسمی روزنامہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ ۱۹؍مئی ۲۰۰۲ء۔

انفرادیت کو خارج از امکان قرار دیا گیا۔ ترقی پسند شاعر عوام کو مخاطب کر کے چند مفید باتیں سنانا چاہتا تھا کہ عوام اس کی دکھائی ہوئی راہوں پر گامزن ہوں، اسی لئے ترقی پسند شاعری میں خطابت کا عنصر غالب ہے۔ ترقی پسند شاعری سیاسی اور انقلابی شاعری میں ایسا اسلوب استعمال کیا گیا، جس سے عوام دشمن طاقتوں کے خلاف نفرت اور بغاوت کی جاسکے، اس مقصد کے تحت بھاری بھرکم الفاظ کے بجائے ایسے عوامی بول چال کے اور عام فہم لفظوں کو جگہ دی گئی جن سے مظلوم طبقے کے لئے عوام میں ہمدردی اور رحم کا جذبہ پیدا ہو سکے، ترقی پسند شاعری کا تعلق پڑھنے سے زیادہ سننے سے رہا۔ اس وجہ سے ترقی پسند شاعر عوام کو متاثر کرنے والے الفاظ اور لہجہ کے اتار چڑھاؤ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اکثر ترقی پسند شاعر شاعری کو مقبولیت عوامی نعروں کے ساتھ دینے لگے۔ اس رجحان کے خلاف سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> ''واعظانہ اور خطیبانہ انداز بھی ہماری انقلابی نظموں میں کافی پایا جاتا ہے یہ بھی پرانے طرز کی شاعری کا ایک ترکہ ہے، جس سے ہم دامن چھڑالیں تو اچھا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ ہمیں نوجوانوں پر اثر ڈالنا ہے انہیں ترقی پسندی اور عمل کے راستے پر لے جانا ہے ان کے جذبات کو بیدار کرنا ہے لیکن فن کے ماہر جانتے ہیں کہ ناصح چاہے کتنا ہی مشفق کیوں نہ ہو ہمیشہ ناپسند کیا جاتا ہے، نوجوانوں سے خطاب طالب علموں سے خطاب، سپاہی سے خطاب، کسانوں سے خطاب اب بند ہونا چاہئے۔ اگر آپ کو کچھ لکھنا ہو تو آپ ملاپن چھوڑیے لوگ آپ کا مذاق اڑانے لگیں گے بہتر تو یہ ہے کہ آپ کسی کو مخاطب نہ کیجئے، زمانے پر نظر ڈالئے، حالات کو سمجھئے، اور جو کہنا ہو کہہ ڈالئے اور یہ پامال موضوع اب ترک ہونے چاہئیں، ان میں بہت سی باتیں کہہ چکے ہیں آپ انہیں کیوں دہراتے ہیں۔''(۱)

سجاد ظہیر کے اس متوازن نقطۂ نظر سے ترقی پسند شاعری میں بلند آہنگی خطابت اور سستی نعرے بازی کے عناصر کم ہونے لگے اور ادب کے نام پر کھلے ہوئے اشتراکی پروپیگنڈے اور مقصدیت میں کمی آنے لگی۔

---

(۱) جدید اردو نظم نظریہ اور عمل عقیل احمد صدیقی ص ۱۱۲ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۰۔

رفتہ رفتہ شاعری میں ہنگامی موضوعات اور باتوں پر زور کم ہونے لگا اور مستقل اور پائیدار قدروں پر زور دیا جانے لگا اس سے ان کے لب ولہجہ اور اسلوب میں تبدیلی آئی اور نئے ڈھنگ سے زندگی کی تصویروں میں رنگ بھرنے لگے تاکہ عوام میں زندگی کی قدیم روش کو بدلنے کی خو پیدا ہو سکے، چنانچہ اب مزدوروں اور کسانوں کی عصبیت زدہ زندگی کو فنکارانہ پیش کیا جانے لگا اس طرح شاعری میں ایسے الفاظ اور تشبیہ واستعارے استعمال میں لائے گئے، جو حالات کی سنگینی کو ابھارتے ہوئے ہمدردی کے جذبات پیدا کر سکیں۔ ترقی پسندوں نے اپنی شاعری میں ایسی علامتوں کو جائز قرار دیا، جنھیں بہ آسانی سمجھا جاسکے۔ علامتوں کے استعمال میں وہ اس کی معنوی اشاریت کے قائل تھے، لہٰذا تاریخی سیاسی غیر جمہوری تصور حیات کی علامت سرخی انقلاب کی علامت اور صبح اور روشنی سورج وغیرہ سب نئی زندگی کی علامت بن گئیں۔ مخدوم، فیض اور ساحر وغیرہ کے یہاں اس قسم کی علامت نگاری کی اچھی مثالیں ہیں۔

ترقی پسند شاعروں کے یہاں بیانیہ کی بہترین مثالیں نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں عتیق اللہ ترقی پسند اور بیانیہ شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسندوں نے بیانیہ کو اپنے پیش رووں سے بہتر طور پر اور بڑی حد تک خلاقانہ طریقے سے برتا ہے، حالی، ظفر علی خاں یا جوش کے بیان سے یہ آگے کی چیز ہے اس بیان میں کلاسیکی وقار اور کلاسیکی بغیر قدرت کلامی کے بیانیہ میں کامیابی پالینا مشکل امر ہے، ترقی پسندوں کا بیانیہ محض جوش بیان یا زور بیان سے آگے نہیں جاتا ترقی پسندوں نے بیان کی کمتر مثالوں کے ساتھ ساتھ بہتر مثالیں بھی پیش کی ہیں۔''(۱)

بہر حال اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند شاعروں پر بیانیہ عنصر غالب ہے، اور بیانیہ کی بہترین مثالیں ہیں اس ضمن میں جوش کے پر جوش اور خطیبانہ لب ولہجہ کے اثرات سے بھی انکار ممکن نہیں ہے، بہ الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسند انقلابی شاعری جوش کے نقش پر ایک عرصے تک چلی ہے۔

---

(۱) قدر شناسی عتیق اللہ ص ۶۲ ادارہ اشاعت اردو ۱۹۷۸ء۔

ترقی پسند شعری اسلوب میں جو احتیاج کی ایک تند لے وہ طنز کے اشعار میں تضحیک و تمسخر کی آمیزش ہے نیز لہجے میں جو رجائیت اور اعتماد کی رمق ہے اس کی پشت پر جوش کے اثرات ہی کام کر رہے ہیں۔

کیفی اعظمی کا اسلوب

کیفی کا شمار ان منتخب ترقی پسند شاعروں میں کیا جاتا ہے، جو شاعری میں زبان کے استعمال کو محض خیالات کی ترسیل عقائد کی تبلیغ اور سیاسی پروپیگنڈے کا ذریعہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسے اپنے محسوسات اور جذبات کی صورت گری کا ایک ذریعہ بھی خیال کرتے ہیں۔ کیفی نے اپنی شاعری میں تشبیہ استعارے او رکنایہ کی زبان بھی استعمال کی ہے اور اظہار کے بیانیہ و خطیبانہ دونوں پیرایوں کو خوب برتا ہے، اسلوب کے اعتبار سے کیفی کی شاعری کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے، جھنکار اور آخر شب کی شاعری براہ راست طرز اظہار اور بیانیہ انداز کی شاعری ہے، جبکہ آوارہ سجدے کا نمایاں پیرایہ اظہار علامتی ہے، کیفی ترقی پسند شاعروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں اس لئے ان کے اسلوب میں ترقی پسند شعری اسلوب کی تمام خصوصیات موجود ہیں اس کے ساتھ ان کے اسلوب میں وہ خصوصیات بھی ہیں، جو ان کی انفرادیت کہی جا سکتی ہیں، کیفی کی ابتدائی شاعری کے بارے میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> ''کیفی کی شاعری قدیم و جدید دونوں قسم کی ادبی غلاظتوں سے پاک ہے، اس میں سچی ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے اس کے خیالات و نصب العین صاف اور متعین اس کا طرز بیان سیدھا اور براہ راست اس کی تشبیہیں و استعارے نئے اور دلکش ہیں۔''(۱)

کیفی مزدوروں اور محنت کش عوام کے شاعر ہیں، اس لئے ان کا اسلوب بھی ایسا ہے، جو اس طبقے سے مطابقت رکھتا ہو یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب فنی پیچیدگیوں سے مبرا ہے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''کیفی کی بیشتر نظموں کے مخاطب یہی محنت کش عوام ہیں ان نظموں میں سیدھا

---

(۱) پیش لفظ جھنکار سجاد ظہیر کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ص ۳۶۲۔

سادہ طرز اظہار اور جوشیلا لب و لہجہ ہے، وہ جدو جہد کرنے والے مزدوروں اور کامگاروں کے جذباتی آہنگ سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے ان نظموں میں کوئی پیچیدہ امیجری یا چونکا دینے والے تجربات نہیں لیکن ان میں سماجی اور سیاسی تناؤ کی جو فضا ہے وہ اس عہد کی بنیادی آویزشوں اور تضادات کی ترجمانی ضرور کرتی ہے۔"(۱)

کیفی کا کلام ان کے عہد کا ترجمان ہے، جس کے اہم عناصر بلند آہنگی اور خطابت کا اندازہ ہے، اس کے باوجود ان کا لہجہ سپاٹ نہیں بلکہ اس میں میر انیس کے کلام کی شیرینی ہے، جن سے کیفی بہت زیادہ متاثر تھے، بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

"کیفی کی نظموں میں بھی خطابت کا عنصر بہت ہے لیکن ان کے لہجے میں درشتگی او رکرختگی نہیں، نیز کیفی کے اسلوب بیان میں انیس کے مرثیوں کی روایات کے بہت سے عناصر جذب ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے ان کی آواز جعفری کی طرح پھٹ کر نہیں بکھر جاتی بلکہ وضاحت اور روانی باقی رہتی ہے۔"(۲)

کیفی نے خطیبانہ عناصر سے بہت زیادہ استفادہ کیا لیکن ان کی خطیبانہ شاعری محض ہنگامی موضوعات کے واشگاف اظہار سے عبارت نہیں، جبکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سیاسی بلند آہنگی اور تبلیغ سے ان کی شاعری کا تاثر کم ہو جاتا ہے، شارب ردولوی لکھتے ہیں:

"کیفی کی شاعری میں سیاسی بلند آہنگی نے انہیں نقصان پہونچایا ان میں اظہار کی جو بلا کی صلاحیت تھی اس کی چمک ان کی ہر نظم اس کے اشعار اور ان کی لفظی صورت گری میں نظر آتی ہے، لیکن جب وہ سیاست پر زور دیتے ہیں یا تبلیغ کرنے لگتے ہیں تو ان کی شاعری کا تاثر کم ہو جاتا ہے۔"(۳)

---

(۱) کیفی کا تخلیقی سفر قمر رئیس کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۲ء۔

(۲) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۶ء۔

(۳) کیفی کا شعری سفر شارب ردولوی ص ۱۸۱ کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۲ء۔

یہ الزام قریب سبھی ترقی پسند شعراء پر لگایا جاتا ہے اور ایک حد تک صحیح بھی ہے اسی لئے ترقی پسند انجمن کے دستور کے تحت نظموں کے عنوان ٹھوس اور مرئی حقیقتوں پر مرکوز رکھنے کی بات کہی گئی تھی اس لئے منشور کی پابندی کرتے ہوئے سیاست پر زور بیان صرف کیا، اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ چند کو چھوڑ کر بہت سے شاعر نعرے بازی سے کام لینے لگے، اس حقیقت سے الگ یہ بات کہی جاسکتی ہے کیفی نے ترقی پسندوں کے دائرے میں رہ کر بھی اپنی نئی راہیں تلاش کیں اور وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔ یلغار سرخ جنت، اسٹالن کا فرمان، روسی عورت کا نعرہ تلنگانہ، مژدہ، تلاش، تربیت، نئے خاکے، نئی جنت کرن سویت یونین اور آزادی، فتح برلن، سلام، لال جھنڈا، خانہ جنگی، آوارہ سجدے ماسکو تاشقند لینن دھماکہ بنگلہ دیش اور فرغانہ وغیرہ کے ٹھوس اور مرئی حقیقتوں پر رکھے گئے ہیں۔ ان نظموں میں تمثیل تشبیہ استعارے علامتوں اور پیکروں کا کمتر ہی اظہار ہوا ہے، اور براہ راست بیان قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ کیفی کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے شعری اظہار میں بیان کو براہ راست راہ دی اس لئے مشرقی شاعری کی روایت میں خطابت کی روایت بہت قوی اور مستحکم ہے اور آج بھی اسے سننے سنانے کی چیز سمجھا جاتا ہے کیفی نے خود بھی آوارہ سجدے کے دیباچے میں شاعری کو سننے سنانے کی چیز کہا ہے، وہ اسے لیٹ کر خاموشی سے پڑھنے کی چیز نہیں تسلیم کرتے، وہ لکھتے ہیں:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی شاعری کا بہت اہم عنصر ہے، جب آپ چپ چاپ لیٹ کر شعر پڑھتے ہیں تو اس کی موسیقی آپ کے دل و دماغ تک پہنچ ہی نہیں پاتی صرف الفاظ ہاتھ آتے ہیں اور صرف الفاظ کا نام شاعری نہیں۔'' (۱)

ان لفظوں سے کیفی کے تصور شعر پر روشنی پڑتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ کیفی اصلاً محفلوں میں سننے سنانے کی روایت Oral tradition کے شاعر ہیں اس لئے ان کے یہاں خطیبانہ عنصر زیادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن عتیق اللہ کے مطابق خطابت سے نظم کی زیریں سطح یا تہہ دار کو نہیں چھوا جاسکتا اور جہاں کیفی کے اوور ٹون میں

---

(۱) دیباچہ آوارہ سجدے کیفی اعظمی۔ کلیات کیفی اعظمی: کیفیات ص ۱۷۱ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۳ء

شگاف ہوتا وہ شعر کی زیریں سطح چھو لتے ہیں۔

''کیفی اعظمی کے مرغوب اوورٹون میں جہاں کہیں شکن پیدا ہوئی ہے وہاں نظم نے زیریں سطح کو پالیا ہے ان کی شاعری میں خار شگافی اور سرگوشی متوازی طور پر برسرکار ہے خصوصاً آوارہ سجدے کی بیشتر نظموں میں یہ اشتراکیت تہہ نشست ہے۔''(۱)

اسی بات کو مظفر حنفی نے یوں کہا ہے:

''کیفی کی دور اول کی نظمیں غنائیہ اور رومانی ہیں دوسرے دور کی نظمیں بیانیہ اور خارجی شاعری کے اچھے نمونے ہیں اور دور سوم کی زیر بحث نظمیں غنائیہ اور بیانیہ کا حسین امتزاج داخلیت اور خارجیت کا خوبصورت آمیزہ ہیں۔ اور یہ چیزیں اس طرح پیچ در پیچ دائرہ در دائرہ کیفیات کے ساتھ اپنے مختلف شیڈس لیکر نظموں میں منعکس ہوتی ہیں، جن کی مثالیں ترقی پسند شاعروں میں کمیاب ہیں۔''(۲)

کیفی نے اپنی شاعری میں طنز کا استعمال بڑے سلیقے سے کیا ہے، بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

''کیفی نے طنزیہ اسلوب کو بھی خوبی سے نبھایا ہے۔''(۳)

کیفی کی نظمیں ملک میں پھیلی ہوئی سیاسی اتھل پتھل لیڈروں کے داؤں پیچ اور ان کے پرفریب وعدے اور سماجی ناہمواریوں کی تصویریں ہیں کیفی نے ان تمام کیفیات کا بغائر جائزہ لیا اور انہیں اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے، مظفر حنفی کے مطابق:

''شدت احساس اور جذبے کی کارفرمائی نے کیفی اعظمی کی ترقی پسندانہ شاعری میں طنزیہ اسلوب کا بھی جادو جگایا ہے۔''(۴)

---

(۱) قدر شناسی عتیق اللہ ادارہ اشاعت اردو ۱۹۷۸۔
(۲) جہات و جستجو ڈاکٹر مظفر حنفی ص ۱۲ طبع اول ۱۹۸۲۔
(۳) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۴۹ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۶۔
(۴) جہات و جستجو ڈاکٹر مظفر حنفی ص ۱۲ طبع اول ۱۹۸۲۔

کیفی کی ابتدائی دور کی شاعری میں مولوی کا رجز اور منظر خلوت قابل ذکر طنزیہ نظمیں ہیں ان میں کیفی نے مذہبی ٹھیکیداروں کی بے عملی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے ترقی پسند طنزیہ نظموں میں پیتل کے کنگن، تنخواہ، نئے مہربان، لال جھنڈا، سپردگی، قومی حکمراں تاریکی میں، ناقص بھرتی، قومی اخبار کوریا کا نعرہ اور خانہ جنگی وغیرہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں ترقی پسند موضوعات کے تحت سیاسی سماجی حالات کی ٹیڑھی چال پر طنز کیا گیا ہے۔ یہ دوسرے دور کی نظمیں کہی جاسکتی ہیں تیسرے دور کی نظموں میں مکان، ابن مریم، بہروپنی، گربھ وتی، دائرہ، دوسرا طوفان، کھلونے، چراغاں، عالمی امن، دھاکہ، میرا ماضی میرے کاندھے پر سانپ، شانتی بن کے قریب گم شدہ شہر وغیرہ طنزیہ نظمیں ہیں، ان میں طنزیہ اسلوب بڑی خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے۔

شروع میں کیفی کے یہاں طنز زیر سطح ہے، کیونکہ انہیں امید تھی کہ وہ ناہمواریوں پر فتح پالیں گے، لیکن جب حالات میں شدت پیدا ہوئی اور درد حد سے گزر گیا تو ان کا طنز سطح سے ابھر آیا۔ اس کے باوجود انہوں نے دامن امید نہیں چھوڑا اور برابر تابناک صبح کے منتظر رہے۔

کیفی نے اپنی شاعری میں پیکروں کا بھی نہایت خوبصورت استعمال کیا ہے۔ ان کے پیکر پیچیدہ نہیں ہیں۔ اسی لئے کہ وہ قاری یا سامع کو سیدھے طور پر براہ راست اثر کرتے ہیں کیفی کے پیکروں میں سمعی اور بصری دونوں عناصر کی موجودگی ایک ساتھ نظر آتی ہے کیفی کے بصری پیکر کے تعلق سے شافع قدوائی لکھتے ہیں:

> ''ان کی شاعری میں بصری پیکر تواتر کے ساتھ فنکارانہ شعور کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں ایسا لگتا ہے کہ ہر تجربہ شاعر کے حواس پر آنکھ کے حوالے سے وارد ہوتا ہے۔''(۱)

پیکر کے علاوہ کیفی کی شاعری میں استعارے بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں کیفی کے استعارے تاریخی اور روایتی اہمیت کے حامل ہیں۔ کیفی کے آخری دور کی شاعری میں علامت نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان نظموں میں کیفی نے مشہور تلمیحات اور جدید شعری اظہار سے بھی استفادہ کیا ہے، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کیفی کی

---

(۱) ایوان اردو دہلی ماہنامہ بابت اکتوبر ۱۹۹۸ ص ۱۵۔

شاعری میں اشاریت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''کیفی کے یہاں اشاریت بے حد کم ہے.......... ویسے جہاں کہیں ان کے لہجے میں قرار اور ٹھہراؤ ملتا ہے اشاریتی انداز اپنی جھلک دکھادیتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اسی قدر واضح بھرپور اور اسی کے ساتھ اس قدر وافر نہیں کہ قابل بیان اور لائق تجزیہ قرار دیا جائے، ان کی ایسی شاذ و نادر اشاریت کی حامل منظومات میں ابن مریم اور آثار قدیمہ ہیں، ابن مریم میں اشاریت کی چلت پھرت عموماً زیادہ ہے۔''(۱)

علامت نگاری کے تعلق سے کیفی کی شاعری کے متعلق پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''کیفی اعظمی کے یہاں علامتی شاعری کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ لیکن وہ اس وقت نظر آسکتی ہیں، جب ہم اپنی خود ساختہ تنقید کی عینک اتار کر انہیں دیکھنے کی کوشش کریں اس وقت کیفی کی شاعری میں علامتی شاعری کے کئی خوبصورت نمونے ہمیں نظر آئیں گے۔''(۲)

لہٰذا کیفی کی وہ نظمیں جن کے موضوع ٹھوس مرئی حقیقتوں یا اہم واقعات پر رکھے گئے ہیں انہیں چھوڑ کر ان کے یہاں علامت نگاری کے عناصر بھی موجود ہیں ان کی علامتیں وسیع معنویت اور اشاریت پیدا کرتی ہیں۔ دائرہ، ابن مریم، کھلونے، بہروپنی، گر بھ وتی، چراغاں، زندگی، میرا ماضی میرے کاندھے پر سانپ، پرسکون سمندر وغیرہ منظومات علامتی شاعری کی عمدہ مثالیں ہیں اس ضمن میں ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''علامتوں کو برتنے والے بہت ہیں بلکہ یوں کہئے کہ علامت اور سمبل فیشن بن گئے ہیں کیفی نے ان میں پناہ گاہیں تلاش نہیں کی ہیں البتہ اظہار وعرفان کے لئے پہلو ضرور تلاش کئے ہیں۔ اگر انہوں نے صرف ابن مریم نظم لکھی ہوتی تو بھی وہ اس جدید علامتی حسیت کے کامیاب ترین فنکاروں میں گنے جاتے۔''(۳)

---

(۱) اردو شاعری میں اشاریت ڈاکٹر سلمان اطہر ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۳۔

(۲) کیفی کی شاعری پر طائرانہ نظر جگن ناتھ آزاد کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۲۔

(۳) معاصر ادب کے پیش رو ڈاکٹر محمد حسن ص ۹۴ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی ۱۹۸۲۔

مجموعی طور پر یہ کہنا درست ہے کہ کیفی اعظمی اپنی شاعری میں فنی لوازمات پر پوری توجہ دیتے رہے ہیں اس لئے ان کے یہاں زبان وبیان کی متنوع خوبیاں موجود ہیں کیفی کی کئی نظمیں فن کے معیار پر پوری اترتی ہیں جو انہیں نہ صرف ترقی پسند شاعری میں بلکہ پوری اردو شاعری میں اہم مقام حاصل کرا سکتی ہیں۔

بقول محمد ایوب واقف:

"ان کی نظموں میں زبان کی صفائی وشستگی خیالات کی طرفگی طرز بیان کی عمدگی خاصے کی چیزیں ہیں، انہوں نے سستی ہلکی اور سطحی قسم کی شاعری بہت کم کی ہے، ان کی وہ نظمیں جو اشتراکیت کے پروپیگنڈے کے لئے کہی گئی ہیں اور جن کی تعداد بھی کافی ہے، ان کو چھوڑ کر باقی ماندہ نظموں کو اگر فن کے اعلیٰ معیار پر جانچا جائے تو بلاشبہ کئی کامیاب نظمیں ملیں گی۔ ایسی نظموں کا شمار ہم صرف ترقی پسند شاعروں کی ہی اچھی نظموں میں نہیں بلکہ اردو کی پوری شاعری میں بلند معیار کی حامل قرار دے سکتے ہیں۔"(۱)

حقانی القاسمی رقم طراز ہیں:

"کیفی اعظمی انسانی احساس کے شاعر ہیں انہیں انسان کا غم ستاتا ہے، رلاتا ہے ان کی نظمیں قصر ایوان میں پھنکارتی ہیں اور فٹ پاتھ پر نیند کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہیں تو کبھی محرومیوں کے مینار کھڑے کرتی ہیں تو کبھی حسرتوں کے کوہ البرز ان کی نظمیں دراصل اس جگر سوختہ انسان کی مانند ہیں، جس کے بدن پر ہزاروں زخم ہیں تمام بدن پر داغ ہیں ایسا بدن جو درد سے کراہتا رہتا ہے، سارے جہان کا درد جس شاعری کے سینے میں محسوس ہوتا ہے وہ کیفی اعظمی کی ہے...... مگر اس درد کے باوجود علوئے انسانیت احترام آدمیت کے خواب روشن ہیں، ان کی شاعری ماورائے انسان ماورائے زمان ومکان ہے۔"(۲)

مختصر یہ کہ کیفی ایک صاحب طرز شاعر ہیں ان کی نظمیہ شاعری اردو شاعری کے سرمائے میں اپنی ایک علاحدہ پہچان رکھتی ہے، جو اہم بھی ہے عظیم بھی۔

---

(۱) میرا پڑوسی محمد ایوب واقف کیفی اعظمی عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۲۔

(۲) جمال وجلال کا پرکیف امتزاج حقانی القاسمی روزنامہ راشٹریہ سہارا ۱۱ اکتوبر ۱۹/ مئی ۲۰۰۲۔

باب ششم

حرف آخر

یہ امر مسلمہ طور پر تسلیم شدہ ہے کہ شخصیت ہمیشہ داخلی اور خارجی کوائف حالات وواقعات سے متاثر ہوکر تشکیل پاتی ہے۔ ناقدین کے مطابق شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں خارجیت کا رول آدھا سے زیادہ قریب تین چوتھائی تک ہوتا ہے اور بقیہ لگ بھگ ایک چوتھائی صرف انفرادیت کی بنا پر جہاں تک انفرادیت کا تعلق ہے، اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے یعنی سماجی اور گھریلو تعینات وغیرہ۔

کیفی نے ایک دین دار مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، جہاں کا ماحول قدامت پسند اور شاعرانہ تھا۔ لکھنؤ کے دوران قیام وہاں کے ماحول اور فضاؤں میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پنپنے اور پروان چڑھنے کا موقع میسر آیا۔ سلطان المدارس جہاں یہ بہ سلسلہ تعلیم داخل ہوئے تھے وہاں کی قدامت پرستی اور دقیانوسی قسم کا ماحول انہیں ایک آنکھ نہ بھایا۔ اس زمانے میں ترقی پسند فضائیں عروج پر تھیں چنانچہ ترقی پسندوں سے ملاقاتیں ہونے کی وجہ سے کیفی بھی ترقی پسند خیالات کے حامی ہوگئے اور مولوی بننے کا ارادہ ترک کرکے کانپور پہونچ گئے۔ وہاں انہوں نے مارکسی لٹریچر کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور مارکسی نوجوانوں کی صحبت میں رہ کر وہ کمیونسٹ ہوگئے۔ وہاں سے ممبئی چلے گئے جہاں انہیں ہندوستان کی بڑی شخصیتوں سے ملنے کا انہیں موقع ملا۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کیفی کے سیاسی عقائد اشتراکیت بقائے باہمی اور امن عالم کے نظریات پر مشتمل ہیں۔ دنیا کی دوسری عظیم شخصیتوں کے مقابلے میں کیفی کو مارکسی نظریہ زیادہ پسند آیا۔ ہندوستان

کے قومی رہنماؤں میں سے انہیں پنڈت جواہر لال نہرو، بھگت سنگھ اور سبھاش چندر بوس وغیرہ نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ چنانچہ وہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں کھل کر قلمی اور عملی طور سے حصہ لینے لگے آزادی کے بعد یہاں کے سیاسی، سماجی، معاشرتی مسائل ومعاملات کے حل کیلئے سرگرم عمل رہ کر اپنی وطن دوستی کا ثبوت فراہم کرتے رہے۔

کیفی فطری طور پر لطیف جذبات اور نازک ترین احساسات لے کر دنیا میں آئے تھے اور عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اپنے گہرے مشاہدوں اور خارجی معاملات کے اثرات سے اپنے عہد کے اتار چڑھاؤ سے گہرے طور پر متاثر ہوتے رہے۔ انہوں نے اپنے اندرون ذات کی گہرائیوں اور تہہ داریوں میں پیدا ہونے والی جذباتی ترنگوں کا کھل کر مقابلہ کیا، جس سے ان کی شخصیت میں ان کی تمام تر شاعری شرابور ہوگئی۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ کیفی کی شاعری ان کے ماحول اور عہد کی پروردہ ہے، جس کی نمایاں طور پر تکمیل خارجی اور داخلی عناصر سے مل کر ہوئی۔ ان کا عہد ترقی پسند خیالات کا عہد ہے، جس زمانے میں انہوں نے شعر کہنا شروع کیا اس وقت رومانی رجحان دھیرے دھیرے اپنی واضح شکل اختیار کر رہا تھا اور یہ رومانی رجحان مغربی شاعری اور ادب کے وسیلے سے اردو شعراء کے حصے میں آیا تھا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ رومانیت کا بڑھتا ہوا عروج کسی تحریک سے کم نہ تھا تو شاید زیادہ مناسب ہوگا، جس نے اردو فنکاروں کو اپنے اندر سمیٹ لیا تھا یہی جبہ ہے ترقی پسند شعراء کے یہاں ابتدائی دور میں رومانیت کی گونج سنائی دیتی ہے۔

رومانی اور عشق پرور جذبات سے مملو موضوعات کے علاوہ اس دور کا دوسرا رجحان جو نمایاں طور پر ۱۹۳۵ء کے بعد سے ابھرا کمیونزم یا اشتراکیت تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں ترقی پسندی بیسویں صدی کے روسی انقلاب اور کارل مارکس کی جدلیاتی مادیت کے فلسفے پر استوار ہے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد سے تمام دنیا میں اشتراکیت کی تحریک سرمایہ داری کو ختم کرنے مزدوروں اور محنت کشوں کو ان کے حقوق

دلانے کے لئے سرگرم عمل ہوئی کیونکہ اس وقت قریب قریب دنیا بھر کے حالات ایک جیسے تھے۔ چنانچہ ہر ملک کے شاعر اور ادیب مارکسی نظریات سے متاثر ہوئے اس کی سرگرمی اتنی بڑھی کہ ۱۹۳۵ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس پیرس میں منعقد کی گئی، جس میں دنیا بھر کے شاعر و ادیب شریک ہوئے۔ ہندوستان کے نوجوان ادیبوں میں سید سجاد ظہیر اور ملک راج آنند بھی شریک ہوئے اسی کے بعد ہی ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ شائع ہوا، اس ترقی پسند ادبی تحریک کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی اس کے بعد باقاعدہ طور پر ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی جو اردو ادب میں ایک نئی زندگی اور نیا رجحان لے کر آئی۔ شروع شروع میں جیسا کہ عام قاعدہ ہے ہر تحریک زیادہ تر تنظیمی ہوتی ہے ترقی پسند تحریک بھی ابتدا میں تنظیمی رہی اور نعرے بازی کے ساتھ آزادی کے حصول کے زمانے میں وقتی اور ہنگامی موضوعات کی شاعری بنی رہی۔ آزادی کے بعد ملک میں ایک نئے دور کی شروعات ہوئی چھٹے دہے کے شروع ہوتے ہوتے حالات بڑی حد تک تبدیل ہو گئے اسی دور میں کمیونسٹ پارٹی کو بھی ایک بحرانی دور سے گزرنا پڑا اور ترقی پسند تحریک کی مقبولیت کم ہونے لگی اس طرح ادبی دنیا میں نئی ہلچل سی مچ گئی۔ اکثر لوگ ترقی پسند شاعر کی نئی حسیت پر زور صرف کرنے لگے کیونکہ یہ کلیہ ہے کہ ہر ادیب و شاعر اپنے عہد و ماحول سے گہری طور پر متاثر ہوتا ہے، جس میں اس کا شعور اور لاشعور دونوں عوامل شامل ہوتے ہیں۔

چنانچہ کیفی کی شاعری نے بھی ان اثرات کو قبول کیا۔ کیفی کو شاعری ورثہ میں ملی تھی گھر میں شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا والد کو شاعری کا بلند ذوق تھا کیفی کے تینوں بڑے بھائی باقاعدہ صاحب تخلص اور صاحب طرز و بیاض شاعر تھے، گھر میں آئے دن شعر و شاعری کی محفلیں اور مشاعرے ہوا کرتے تھے اس ماحول میں رہ کر کیفی نے محض گیارہ برس کی عمر میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ ان کے ابتدائی دور کا کلام ناپید ہے، جو کچھ سرمایہ باقی رہا اس میں مذہبی عقیدت مندی کی فراوانی

کے باوجود ان کی فکر انقلاب آشنا ہو کر ارتقائی منازل کی جانب رواں دواں نظر آتی ہے۔ فکر کی ارتقا کے دوسرے قدم پر کیفی نے خود ساختہ مذہبی اجارہ داری اور نام نہاد ملک کی بے عمل زندگی جس میں صرف قول اور لفاظی کے سوا کچھ نہیں، کو حدف بناتے ہوئے فروغ و بقائے انسانیت کا سبق مارکس، لینن، نہرو، بھگت سنگھ اور سبھاش چندر بوس وغیرہ سے حاصل کیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی شاعری کو انسانیت کی بقا اور اس کے استحصال کے خلاف احتجاج کا وسیلہ قرار دیا۔

کیفی کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلے دور کی شاعری پر رومانیت کا غلبہ ہے۔ اس زمانے کی شاعری مترنم، سبک رفتار اور نغمگی اور غنائیت سے شرابور شاعری ہے، جس میں اثر آفرینی، سادگی اور جذبے کا خلوص موجود ہے، اس شاعری میں رومانی عشقیہ جذبات کے علاوہ مناظر فطرت کی اچھی تصویر کشی رومانی انداز میں کی گئی ہے۔

کیفی کے دوسرے دور کی شاعری میں اشتراکی نظریات اور ترقی پسندانہ رجحانات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ انہوں نے جان بوجھ کر اپنی شاعری کا رخ سیاسی ہنگامی اور وقتی قسم کی ترقی پسندانہ شاعری کی طرف موڑ دیا ہے۔ اس دور کی شاعری میں سیاسی حالات کو بنیاد بنا کر انہوں نے متعدد نظمیں لکھیں، جن میں نعرے بازی کے عناصر بہت کم ہیں۔ کیفی کی ترقی پسندی دوسرے لفظوں میں عقیدت مندی کے درجہ پر فائز ہے۔ اس وجہ سے شدت احساس اور جذبے کی کارفرمائی نے ہنگامی موضوعات کو شعری پیکر عطا کر دیا ہے۔

آزادی کے بعد حالات یکسر بدل گئے تھے اس میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، جس سے کیفی کی شاعری میں بھی بہت زیادہ تبدیلیاں آئیں، جو ان کی شاعری کے تیسرے دور کی نشاندہی کرتی ہیں اس منزل پر کیفی کا اسلوب نمایاں منفرد اور الگ تھلگ ہے۔ اس میں جذباتیت اور بلند آہنگی کے بجائے ایک تھمے ہوئے طوفان کی کیفیت نظر آتی ہے اس دور کی

شاعری میں حقیقت پسندی کے ساتھ ضبط وتحمل اور گہری فکر ونظر کی بہترین مثالیں نظر آتی ہیں، حساس دل اور کشادہ ذہن کے احساسات وتاثرات کیفی کی انفرادیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

کیفی ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے نہایت اہم ہیں۔ اسی لئے ان کے اسلوب میں وہ ساری خصوصیات نظر آتی ہیں، جو ترقی پسند شعری اسلوب کی عام خصوصیات ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب میں وہ خصوصیات بھی موجود ہیں، جو ان کی انفرادیت کو واضح کرتی ہیں۔ کیفی کا کلام ان کے عہد وماحول کا ترجمان ہے، جس کے اہم عنصر بلند آہنگی اور تخاطب ہیں۔ اس کے باوجود یہ بالکل سپاٹ نہیں ہے کیونکہ اس میں انیس کے لہجے کی شیرینی کا پرتو ہے۔

کیفی نے شاعری کو محض سننے اور سنانے کی چیز کہا ہے اس لئے انہوں نے خطیبانہ عناصر سے خوب استفادہ کیا اور ترقی پسندی کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی اپنے لئے نئی راہیں اور نئے افق تلاش کئے۔

کیفی نے اپنی شاعری میں طنز ومزاح کا دخل بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے کیا ہے ملک میں پھیلی ہوئی سیاسی بے چینی لیڈروں کے سیاسی داؤ پیچ اور ان کے پر فریب وعدے اور سماجی نابرابری اور عدم مساوات کو کیفی نے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور اسے اپنے بھرپور طنز کا نشانہ بنایا۔ شروع میں ان کا طنز زیر سطح تھا رفتہ رفتہ یہ سطح سے ابھر کر سامنے آ گیا۔

کیفی کے تراشیدہ پیکروں میں سمعی اور بصری دونوں عناصر کی موجودگی بیک وقت نظر آتی ہے اور ان کے استعارے تاریخی اور روایتی اہمیت کے حامل ہیں کیفی کی شاعری کے آخری دور میں علامت نگاری کے بھی بہترین نمونے موجود ہیں۔ کیفی کی علامتیں وسیع معنویت اور اشاریت پیدا کرتی ہیں ان نظموں میں مشہور تلمیحات اور جدید شعری اظہار سے بھی کسب فیض کیا گیا ہے۔

کیفی اعظمی اپنی شاعری میں فنی لوازمات پر پوری توجہ صرف کرتے رہے۔ اس لئے ان کے یہاں زبان وبیان کی متنوع خوبیاں موجود ہیں اسی لئے ان کی بہت سی نظمیں فکر وفن کے اعلیٰ ترین معیار پر پوری

اترتی ہیں، جو انہیں اردو شاعری میں اہم مقام عطا کرسکتی ہیں۔مختصر یہ کہ کیفی ایک صاحب طرز شاعر ہیں۔
ان کی نظمیہ شاعری، اردو کے شعری وادبی سرمایے میں اپنی ایک الگ ہی شناخت رکھتی ہے۔مجموعی طور پر
ان کی غزلیں حقیقی تجربات سے ماخوذ ہیں، جن میں عصری حقیقتوں کی گہری نشتریت حیات بخش جہد حیات
ایک پختہ تخلیقی شعور کے ساتھ نظمیہ کے اثرات موجود ہیں، جو انہیں ان کے غزل کے قلیل سرمایے کے
باوجود ترقی پسند غزل گو شعراء کی فہرست میں شامل کراتی ہیں۔کیفی کی فلمی شاعری کو بھی نظر انداز نہیں کیا
جاسکتا۔اس میں انہوں نے اپنا معیار قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ان کے فلمی نغموں میں جا بجا سماجی
حقیقت نگاری اور جذبات واحساسات کی مختلف کیفیتوں کا حسین امتزاج ان کے انفرادی اسلوب کی
شناخت قائم کرتا ہے۔

ترقی پسند شعراء نے اپنی شاعری کی شروعات رومانیت کے زیر اثر کی۔لیکن بعد میں ترقی پسند
تحریک سے وابستگی کے بعد ان کے یہاں فکر واحساس میں نمایاں تبدیلی ہوئی اور انہوں نے مارکسی
نظریات کو زیادہ اہمیت دی معاشرے کی تشکیل کا خواب بھی دیکھا۔ترقی پسندوں نے اجتماعی فکر اور مسائل
کو اپنی شاعری میں مارکسی نظریات کے حوالے سے پیش کیا۔اس لئے ان کے کلام میں موضوعات کے
ساتھ ساتھ زبان وبیان کی کسی حد تک یکسانیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔آزادی کے ملنے تک کی شاعری
میں بلند آہنگی اور سستی قسم کی نعرے بازی کے ساتھ ساتھ ادب کے نام پر کھلم کھلا اشترا کی نظریات اور
مقاصد کے پروپیگنڈے اور مقصدیت کا زور رہا آزادی مل جانے کے بعد رفتہ رفتہ ان عناصر میں کمی واقع
ہونے لگی۔چنانچہ ان ترقی پسندوں نے درپیش صورت حال کا زیادہ فنکارانہ اور حقیقت پسندانہ طریقے
سے عکس پیش کرنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک ان کو کامیابی بھی ملی یہیں سے ترقی پسند شعراء کے نقوش
نمایاں ہونے شروع ہوئے۔

یہ حقیقت نا قابل فراموش ہے کہ ترقی پسند شعراء کی رومانی شاعری میں بھی ایسے عناصر موجود ہیں،

جو مختلف ہم عصروں میں مشترک ہیں۔ فیض، مجاز، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر اور کیفی اعظمی کی مختلف نظموں کے عنوانات خیالات واحساسات میں یک رنگی دیکھی جاسکتی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ترقی پسند انقلابی شاعری اسلوب اور لفظیات کے اعتبار سے جوش کا بہت زیادہ پرتو لئے ہوئے ہے، جبکہ جوش اور ترقی پسند تصور انقلاب میں یہ بنیادی فرق ہے کہ ترقی پسندوں کے یہاں نقطہ نظر اور مواد کے اعتبار سے ہم آہنگی اور مطابقت نظر آتی ہے۔

کیفی نے اپنے ہم عصروں کے اثرات قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیش رووں اور قدیم شعراء کی تخلیقات سے بھی استفادہ کرتے ہوئے اپنی شاعری کو رنگ وروپ عطا کیا ہے، انیس کی تصویر کشی، اختر شیرانی کی رومانیت، جوش کی بلند آہنگی اور گھن گرج، اقبال کی خطابت، حالی کی سادگی بیان اور اکبر کا طنز وغیرہ کے ساتھ ساتھ شبلی، ظفر علی خاں، غالب، اسماعیل میرٹھی وغیرہ کے طرز کو بھی اختیار کرنے کی کوشش اور روش کا احساس ہوتا ہے۔

بحیثیت مجموعی کیفی کے یہاں محض گھن گرج نہیں بلکہ تعمیر واصلاح معاشرے کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کی فطری رومانیت، خطیبانہ انداز میں کرختگی نہیں پیدا ہونے دیتی۔ اس میں فنی نزاکتوں کے لحاظ کے ساتھ حقیقت پسندی کے عناصر بھی موجود ہیں۔ زبان وبیان کی متنوع خوبیوں کے ساتھ کیفی کی بہت سی نظمیں فکر وفن کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں، جو انہیں ترقی پسند شاعروں میں اہم مقام اور اردو شاعری کو حیات جاوداں عطا کرتی ہیں۔

کتابیات

اس فہرست میں صرف ان ہی کتابوں اور رسالوں کو شامل کیا گیا ہے، جن کے اقتباسات اس مقالے میں درج کئے گئے ہیں اور وہ کتب یا رسائل جو زیر مطالعہ رہیں ان کے اقتباسات شامل نہیں ہیں ان کو درج نہیں کیا گیا ہے۔

۱- آزادی کے بعد اردو ادب   ڈاکٹر محمد ذاکر   مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی

۲- اردو ادب میں ترقی پسند تحریک   خلیل الرحمٰن اعظمی   ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۶

۳- اردو مثنوی کا ارتقا   سید محمد عقیل   اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۱

۴- اردو ادب کا پچاس سالہ سفر   قمر رئیس عاشور کاظمی   اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۴

۵- ادب کلچر اور رسائل   ڈاکٹر جمیل جالبی   اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۸

۶- آوارہ سجدے (دیباچہ)   کیفی اعظمی   ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۳

۷- ادبی تنقید   ڈاکٹر محمد حسن   فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۹۴

۸- اردو شاعری میں اشاریت   ڈاکٹر سلیمان احمد   ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۳

۹- احتشام حسین حیات شخصیت اور کارنامے - ڈاکٹر فداء المصطفیٰ   طبع اول ناگپور ۱۹۷۵

۱۰- بمبئی کی بزم آرائیاں   رفعت سروش   ادارہ فکر جدید دہلی   ۱۹۸۶

۱۱- پہچان اور پرکھ   آل احمد سرور

۱۲- ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری   یعقوب یاور   ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۷

۱۳- تاریخ اردو ادب   رام بابو سکسینہ

۱۴- ترقی پسند ادب اردو کا پچاس سالہ سفر قمر رئیس   ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ   ۱۹۹۴

۱۵- ترقی پسند ادب   علی سردار جعفری   انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۱

۱۶- ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ   ڈاکٹر صادق   اردو مجلس دہلی   ۱۹۸۱

۱۷-ترقی پسند ادب ایک جائزہ ہنس راج رہبر آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۷۶

۱۸-جدید ادب منظر اور پس منظر سید احتشام حسین یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۶

۱۹-جدید اردو نظم اور یوروپی اثرات حامدی کشمیری مجلس اشاعت ادب دہلی ۱۹۶۸

۲۰-جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ ڈاکٹر عقیل احمد ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۲

۲۱-جگت موہن لال رواں حیات اور ادبی خدمات-ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴

۲۲-جدید اردو نظم نظریہ و عمل ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۰

۲۳-جہات و جستجو طبع اول ڈاکٹر مظفر حنفی ۱۹۸۲

۲۴-جدید اردو ادب ڈاکٹر محمد حسن مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی ۱۹۷۵

۲۵-جدید اردو نظم ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۰

۲۶-خانہ جنگی ایک سیاسی مثنوی ڈاکٹر گیان چند جین معیار پبلی کیشنز ۲۰۰۴ء

۲۷-روشنائی سجاد ظہیر آزاد کتاب گھر کلاں محل، دہلی بار اول نومبر ۱۹۷۵ء

۲۸-عوام اور انقلاب علی احمد فاطمی کیفی ڈاکٹر شباب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۶

۲۹-عکس اور جہتیں شاہد ماہلی معیار پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۲ (مشمولہ سبھی مضامین)

۳۰-عکس اور آئینے احتشام حسین ۱۹۷۷

۳۱-کیفی کی شاعری اور ان کا تصور انقلاب ڈاکٹر سید عبدالباری کیفی ڈاکٹر شباب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۶

۳۲-کیفی اعظمی عوام دوست شاعر ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی کیفی ڈاکٹر شباب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۶

۳۳-کیفی اعظمی جنہیں میں جانتا ہوں اختر راہی ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۸

۳۴-میں اور میری شاعری کیفی اعظمی دیباچہ سرمایہ

۳۵-معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۸۲
۳۶-کیفی کی رومانی شاعری	ڈاکٹر سرفراز نواز	کیفی ڈاکٹر شاب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۶
۳۷-کیفی اعظمی کا تخلیقی سفر	ڈاکٹر قمر رئیس	کیفی ڈاکٹر شاب الدین شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۶
۳۸-قدر شناسی	عتیق اللہ	ادارہ اشاعت اردو دہلی ۱۹۷۸
۳۹-نظر اور نظریے	آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی ۱۹۷۳
۴۰-ملک ادب کے شہزادے	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	کاروان پبلشرز الہ آباد ۱۹۵۴
۴۱-نئے تناظر	وزیر آغا	اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد ۱۹۷۹
۴۲-اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۶۹ء
۴۳-امیر اللہ تسلیم حیات اور شاعری	ڈاکٹر فضل امام رضوی	اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۷۴ء
۴۴-ترانہ شوق	شوق قدوائی	اردو پریس گولہ گنج لکھنؤ ۱۸۸۷ء
۴۵-جدید غزل	رشید احمد صدیقی	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۵ء
۴۶-مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۷۴ء
۴۷-ہندوستان ہمارا	مرتبہ جاں نثار اختر	ہندوستانی بک ٹرسٹ ممبئی جون ۱۹۷۳ء
۴۸-جدید اردو ادب	ڈاکٹر محمد حسن	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی بار اول نمبر ۱۹۷۵ء
۴۹-گفتگو ممبئی تک	از علی سردار جعفری	ترقی پسند ادب نمبر شمارہ ۱۹۷۸ء سے لیکر ۱۹۸۰ء
۵۰-جدید اردو تنقید اصول و نظریات	ڈاکٹر شارب ردولوی	اتر پردیش اردو اکادمی پانچواں اڈیشن لکھنؤ
۵۱-علی سردار جعفری	شخصیت اور ادبی خدمات	خصوصی شمارہ ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر نئی دہلی

رسائل اور جرائد

''سہارا'' انڈیا پریوار	روزنامہ لکھنؤ	۱۹۹۴ء
''ایوان اردو''	ماہنامہ دہلی	روزنامہ لکھنؤ ستمبر ۱۹۹۵ء
''آگ''	روزنامہ لکھنؤ	۱۶ر ستمبر ۲۰۰۹ء
''راشٹریہ سہارا'' لکھنؤ	روزنامہ	۱۹ر مئی ۲۰۰۲ء بروز اتوار
''آج کل'' اردو	دہلی	نومبر ۱۹۹۸ء
''کتاب نما''	دہلی	ستمبر ۱۹۹۵ء
''ایوان اردو''	ماہنامہ دہلی	اکتوبر ۱۹۹۸ء
''ایوان اردو''	ماہنامہ دہلی	اگست ۲۰۰۲ء
''سہارا'' انڈیا پریوار	لکھنؤ	مئی ۱۹۹۱ء
شاہراہ		شمارہ نمبر ۳-۴۰-۱۹۴۹ء
نیادور خصوصی نمبر کیفی اعظمی	جولائی-اگست	۲۰۰۲ء